کرشن چندر



مُسکرانے والیاں

مُسکرانے والیاں

کرشن چندر

مکتبہ اُردو ادب

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

ناشر ——— سرفراز احمد

مطبع ——— زاہد بشیر پریس لاہور

قیمت ——— ۱۲ روپے

ترتیب

مُسکرانے والیاں

دیکھو، دیکھو، وہ مسکرا رہی ہے!

ہم لوگ کافے پاری میں بیٹھے تھے۔ راجہ بھائی ٹاور کے بالمقابل سڑک کے اُس پار۔ کافے پاری اُن دنوں بہت چلتا تھا۔ میزوں کے ارد گرد لوگ کھچا کھچ بھرے ہوتے تھے۔ طالب علم، ملاّح، ادیب، بزنس مین، بے کار، ٹائپسٹ لڑکیاں پھولدار سکرٹ اور بے داغ بلاؤز پہنے ہوئے، اپنی پونی ٹیل کو اک ادا سے جھلاتی ہوئیں، ہر منٹوں پر لپ اسٹک ٹھیک کرتی ہوئیں۔ کیونکہ چائے کا گھونٹ مرد کے بوسے کی طرح ہے۔ لپ سٹک کو پھیلا دیتا ہے!

ہمارے سامنے کی میز والی لڑکی مسکرائی۔ اس کے سیاہ بلاؤز میں چھوٹے چھوٹے سفید سفید امی ٹیشن موتی ٹکے ہوئے تھے اور قریب پڑے ہوئے برقی شمعدان کی روشنی میں یوں جِھلملا اُٹھتے تھے، جیسے اُس لڑکی نے ایک بلاؤز نہیں، ستاروں بھری رات کا ایک ٹکڑا پہن لیا ہو۔ شمعدان کے گلابی سائے میں اُس کا اثر اور بھی چمک گیا تھا۔ اور لپ سٹک خطرناک حد تک گہرا دکھائی دیتا تھا۔

"دیکھو۔ دیکھو۔ وہ مسکرا رہی ہے،" میں نے گلشن سے کہا۔

گلشن نے چور نگاہ سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر کرسی کھسکا کر اُس لڑکی کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا اور ذرا درشتی سے کہنے لگا۔ "چھوڑو۔ چھوڑو۔ اِدھر مت دیکھو۔"

"مگر یہ وہی ہے مُسکرانے والی!" میں نے احتجاجاً گلشن سے کہا۔

گلشن نیوی میں لیفٹیننٹ تھا۔ اُس نے دُنیا دیکھی تھی۔ میں نے دُنیا دیکھی تھی۔ ہم دونوں کی ملاقات پہلی بار لندن میں ہوئی تھی۔ سوہو کی مشتبہ گلیوں میں گھومتے ہوئے، لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے، ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ اور جب سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔ سوہو کی گلیوں میں، ہمیں بڑی پیاری لڑکیاں ملیں۔ مگر سب سے پیاری لڑکیاں تو وہ تھیں جنہیں لندن والے (smiling) کہتے ہیں مسکرانے والیاں۔ یہ لڑکیاں دو دو کی تعداد میں باہر نکلتی ہیں چہرے پر گہرا غازہ، ہونٹوں پر گہرا لپ سٹک، کولہوں پر گہرا گھماؤ۔ دیکھو تو جواب میں یوں خفیف سی مسکراہٹ چہرے پر آتی ہے، خفیف اور ہلکی اور نازک سی مسکراہٹ اپنی بات بھی بن جائے اور عزت بھی رہ جاتے اگر بات بن گئی تو بتیسی کھل گئی۔ اور وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آپ کے ساتھ ہولیں اور نہ بنی تو انہوں نے بھی اک مغرور ادا سے منہ پھیر لیا اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے یوں چلی گئیں۔ جیسے وہ سوہو کی گلیوں میں گھومنے والی شکاری عورتیں نہ ہوں۔ پارک لین کے اُونچے

فلیٹوں میں رہنے والی شریف زادیاں ہوں۔

یہ ہلکی لطیف مگر بیشتر دومسکراہٹ کس قدر دلچسپ ہوتی ہے۔ اس دعوت کا اشارہ کس قدر بلیغ ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ لڑکی مسکرا نہیں رہی ہے، ہونٹوں سے آنکھ مار رہی ہے۔ ہمیں لندن کی SMiLiES بہت پسند آئیں۔ مگر ایک لندن ہی پہ کیا موقوف ہے۔ لندن میں، پیرس میں، بمبئی میں، دہلی میں جہاں جہاں ہوں سر اُٹھاتی ہے۔ اپنے بالمقابل اس تبسّم کو موجود پاتی ہے۔ اس تبسّم میں رنگ، نسل، قوم اور ملک کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ اسی لئے تو مجھے کافے بار کی مسکرانے والی اس قدر پسند آئی تھی، اسی لئے تو میں نے گلشن سے کہا۔

"ارے وہی ہے گلشن وہی ہے۔"

گلشن نے اور بھی مضبوطی سے اپنی کرسی میرے سامنے کھسکا لی۔ تاکہ میں بھی اُسے نہ دیکھ سکوں۔ میں نے ذرا خفا ہو کے کہا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟ تم کب سے صوفی ہو گئے؟"

گلشن سے میں چند ماہ کے بعد ملا تھا۔ بمبئی سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس لئے اُس کی تبدیلی پہ ذرا حیرت بھی ہوئی۔

گلشن نے کافی کی پیالی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اُس کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک کہانی سُنو گے؟

"کہانی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

اُس نے میرے استعجاب کو نظر انداز کرتے ہوتے کہا۔" ایک روز میں کافے لبرٹی میں بیٹھا تھا......

اور ہاں! میں تو یہ پوچھنا ہی تم سے بھول گیا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ تم تو اکثر مجھے شام کو کافے لبرٹی میں مل جایا کرتے تھے۔ آج تمہیں کافے پارس میں کیسے دیکھ رہا ہوں؟"

کافے لبرٹی گلشن کا خاص اڈہ تھا۔ سمندر کے کنارے میرین ڈرائیو کے سامنے، ہم لوگ کافے کے چھتے ہوئے برآمدے میں بیٹھ جایا کرتے تھے اور میرین ڈرائیو پر چہل قدمی کرنے والے خوش پوش جوڑوں کو دیکھتے تھے۔ لبرٹی کافے میں بھی خاصی رونق ہوتی تھی، جوک باکس میں چار آنے ڈال کر آپ کوئی بھی چلتا ہوا مغربی گیت سن سکتے تھے۔ "میمی... میمی! تم ایک بطخ ہو!" یہ گیت گلشن کو خاص طور پر پسند تھا۔ کافے پارس میں تو کوئی جوک باکس بھی نہ تھا!

گلشن نے میرے سوال کو بھی نظر انداز کر دیا۔ کافی کی پیالی پر نظریں جماتے ہوئے بولا "وہ مون سون کی ایک رنگین شام تھی۔ بادل برس کر بکھر گئے تھے۔ اور شفق نے انہیں چھو کر سنہرا اور نارنجی اور قرمزی کر لیا تھا۔ بے قرار سمندر کی بے تاب لہریں کبھی کبھی میرین ڈرائیو کے بند سے ٹکرا کر اتنی بلند ہو کر لوٹتیں کہ چہل قدمی کرتی ہوئی خوبصورت عورتیں اپنے چہرے پر سمندر کی جھاگ کی پھوار کو محسوس کر لیتیں اور چیخ کر فٹ پاتھ سے سڑک پر آ جاتیں۔ اُن کے تھرکتے ہوئے

بدن گھبراہٹ میں بہت ہی دلکش ہو جاتے ہیں۔ تم تو جانتے ہی ہو۔"

"جی نہیں۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں ایک شریف ہندوستانی نوجوان ہوں۔"

گلشن ذرا مسکرایا۔ بولا۔ "خیر! تو وہ ایسی ہی رنگین شام تھی۔ جو ہر شریف زادے کے دل کو کسی شریف زادی کے لئے بے قرار کر دیتی ہے۔ اُس روز میں اکیلا تھا اور کچھ اُکتایا ہوا کچھ جھنجھلایا ہوا۔ موسم کی خوبصورتی اور اپنی مجبوری پر جھلّایا ہوا خاموشی سے کافی پی رہا تھا کہ میرے سامنے کی میز پر ایک سانولے رنگ کا معمر آدمی آکر بیٹھا۔ اُس کا سر بیچ میں سے گنجا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک عجیب سی گھبراہٹ تھی اور اس کی کنپٹیوں کے اُلجھے ہوئے بال بالکل سفید ہو چکے تھے اور وہ بار بار اپنے اردگرد اس طرح دیکھ لیتا جیسے کسی گاہک کو تلاش کر رہا ہو۔

"گاہک کو؟" —— میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس لئے میں نے پوچھ لیا۔

"ہاں!" گلشن بولا۔ "اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ سترہ اٹھارہ برس کی اُس کی عمر ہوگی۔ اُس نے گجراتی وضع کی ایک ساڑھی پہن رکھی تھی۔ باریک دھاریوں والی سلیٹی رنگ کی ساڑھی تھی۔ جوڑے میں چمپئی دینی تھی اور اُس کا کھلتا ہوا گندمی رنگ کندن کی طرح دمکتا تھا۔ وہ متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ لیتی تھی۔ کبھی تو اُس کی نگاہ سیدھی اور سپاٹ ہوتی۔ جیسے اُس نگاہ کو کسی سے کچھ واسطہ ہی نہیں ہے۔ کسی سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ جیسے وہ نگاہ اپنے

آپ ہی لگتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی لہروں کی اُچھال کی طرح اُس کی نگاہ کسی ایک چہرے کو چھُو لیتی۔ کوئی چہرہ اُسے دلچسپ معلوم ہوتا اور وہ مُسکرا اُٹھتی۔۔۔۔ بالکل وہی مسکراہٹ!

پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہی خفیف ہلکی سی مسکراہٹ جیسے کسی کو جاننے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

ہیلو! تم کون ہو اور کیا ارادہ ہے تمہارا؟

جب وہ میری طرف دیکھ کر مُسکرائی تو میں اُس کی ادا سے ہی سمجھ گیا کہ یہ کون ہے؟ پُرانا تجربہ میرے کام آیا اور میں بھی جواب میں مُسکرا دیا۔ اُسی پیشہ ور مشاق سے۔ میں تو وہی ہوں جس کی تمہیں تلاش ہے۔ کنوارا اور اوباش۔ اور دیکھو۔ یہ شام کس قدر رنگین ہے۔ کیا ہم اسے رنگین تر نہیں بنا سکتے؟ حیرت ہے کبھی کبھی ایک نگاہ اتنا کچھ کیسے کہہ دیتی ہے۔ جو ایک پوری کتاب بھی نہیں کہہ سکتی۔

دوسرے لمحہ ہی لڑکی نے مُنہ پھیر لیا۔ اب اُس کی نگاہ سیدھی اور سپاٹ تھی اور اُس کے اندر میرے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ آخر میں اتنا بُرا تو نہیں ہوں۔ لڑکیوں کی رائے میرے بارے میں ہمیشہ اچھی رہی ہے۔

میں نے اُس کے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ بوکھلا سا گیا تھا۔ آدمی اناڑی معلوم ہوتا ہے۔ اس تہذیب کا فے میں پہلی بار آیا ہے۔ سودا کرنے کے ڈھنگ

سے پوری طرح واقف نہیں ہے۔ بڈھے کے چہرے پر ایک معذرت خواہ تبسم تھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ تم اس کا ذرا خیال نہ کرو۔ یا شاید وہ نگاہ کہہ رہی تھی یہ تو مجبوری ہے۔ ورنہ میں شریف آدمی ہوں اور اس دھندے کے لئے پہلی بار باہر نکلا ہوں۔ تم نے مجھے پہچان لیا۔ اچھا نہ کیا۔

کچھ بھی ہو۔ وہ میری تیز نگاہ کے بھانپنے کے انداز سے گھبرا گیا تھا۔ جلدی جلدی میں اُن دونوں نے اپنی کافی ختم کی۔ بیرے کو بل ادا کیا اور جلدی سے وہ دونوں کافے سے باہر نکل گئے۔ چلتے چلتے میں نے دیکھا۔ لڑکی سرو قامت ہے اور جسم کے خطوط کہہ رہے ہیں کہ بھرپور جوانی میں ہے۔

"بے وقوف" بے اختیار میرے مُنہ سے نکلا۔

"تم سُنو تو" گلشن ذرا سختی سے بولا۔ "اس کے چند دنوں بعد پھر اُسی کافے میں میری اُن سے مُلاقات ہو گئی۔ وہ مجھ سے پہلے ہی ایک میز پر بیٹھے تھے۔ وہی دونوں۔ وہی سانولے رنگ کا معمر آدمی، وہی گندمی رنگ کی حسینہ۔ میں اُن کے قریب کی میز پر آ کے بیٹھ گیا۔ وہ لڑکی میری طرف دیکھ کر مُسکرائی۔ جیسے برسوں کی شناسا ہو۔ جواب میں میں بھی مُسکرایا۔ یا وہ بدن چُرا کر اپنی کرسی پر الگ ہو کے بیٹھ گئی۔ دُوسری بار جب اُس نے میری طرف دیکھا تو اُس کی نگاہ بالکل سیدھی اور سپاٹ تھی جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔

"حرافہ ہے۔" میں نے دل میں سوچا۔ "اپنے آپ کو مہنگا ثابت کرنا چاہتی ہے

یوں بھی ہوتا ہے۔ مگر میں بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔"

میں نے بھی اُس کی طرف سے نگاہ ہٹالی اور اطمینان سے چکن سینڈوچ کھانے میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جو مجھے بہت لمبا عرصہ معلوم ہوا۔ میں نے جب پھر اُس کی طرف دیکھا تو وہ متجسس نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ اب میں نے اُس کی نگاہ پکڑ لی تھی۔ اسلئے وہ بھی بے باکانہ مسکرائی۔

میں اپنی میز سے اُٹھ کر اُن کی میز پر چلا گیا اور ایک کرسی کھسکا کر بڑے اطمینان سے اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ لڑکی برابر میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اُس کی نگاہ میں کسی قسم کا خوف اور ڈر نہ تھا۔ بڈھے کے چہرے پر البتہ ایک عجیب سی خفت تھی اور اُس کے چہرے پر وہی گھبرایا ہوا معذرت خواہ تبسم تھا۔

میں نے اس کی گھبراہٹ کو دُور کرنے کے لئے کہا "گھبرایئے نہیں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ آپ کا راز ہمیشہ میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔"

پھر میں نے لڑکی کی طرف متوجہ ہو کے اُس سے پوچھا "آپ کا نام کیا ہے؟"

"کملا" وہ بڑی بے باکی سے بولی۔

میں کملا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے ہی والا تھا کہ بڈھے نے بڑے پریشان لہجہ میں مجھ سے کہا "آپ سمجھے نہیں!"

"میں سب سمجھتا ہوں" میں نے اُسے آنکھ مار کر کہا۔

وہ اور بھی گھبرا گیا۔ بولا "آپ بالکل نہیں سمجھے۔ یہ میری بیٹی۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا" میں نے اُس سے کہا۔ "ہر خوبصورت کسی نہ کسی کی بیٹی ہوتی ہے۔" پھر میں نے اُسے قابلِ اعتبار نہ سمجھ کر کملا سے کہا "ڈانس کر لیتی ہو؟"

"ہاں!"

بُڈھا بے حد گھبرا کر بولا "آپ نہیں جانتے میں کون ہُوں؟"

وہ میز پر جُھک گیا "میں اس شہر کا ایک معزز شہری ہوں۔ یہ میری بیٹی ہے کملا مجھے معاف کیجئے۔ اس کی مسکراہٹ کا کوئی مطلب نہ تھا یہ تو... یہ تو..." وہ رُک کر بولا..... "یہ پاگل ہو چکی ہے۔"

بڈھے کا چہرہ میز پر جھک گیا تھا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ رندھے ہوئے گلے سے بولا "میں اسے اس لئے یہاں لایا ہوں۔ کیونکہ ڈاکٹروں نے کہا ہے اسے اکیلا گھر میں نہ رہنے دو۔ اِسے مجمعوں میں لے جاؤ۔ ہنگاموں میں لے جاؤ۔ اِسے بھیڑ بھاڑ سے شناسا ہونے دو۔"

میں نے بُڈّھے کی طرف دیکھا۔ پھر چونک کر کملا کی طرف دیکھا۔ اب اُس کی نگاہوں میں کسی کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ نگاہ سیدھی اور سپاٹ تھی اور کافے کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے سروں سے پھسلتی ہوئی کہیں اُوپر جا رہی تھی۔ وہ نگاہ جیسے کہہ رہی ہو۔ میں کوئی نہیں ہوں اور کوئی میرا نہیں ہے۔ اور جہاں میں ہوں وہاں کوئی نہیں آسکتا۔ میری رُوح کبھی کسی سے محبت نہ کر سکے گی اور میں کسی کا ہاتھ تھام کے سمندر کے کنارے کنارے نہ چل

سکوں گی اور میری جوانی کے بہاروں کے پھول اسی طرح گِر کر مرجھا جائیں گے اور کسی پہ میں اپنا حق نہ جتا سکوں گی۔ کسی کی یاد میں رو نہ سکوں گی اور کوئی بچہ میری کوکھ سے پیدا نہ ہوگا اور کسی کے معصوم ہونٹوں کے لئے میری چھاتیوں کا دودھ بے قرار ہو کر نہ اُبل سکے گا۔ سمندر کی لہر، رات کے تارے۔ گگلوں شفق کے سنہری جال۔ ایک سسکی۔ ایک آنسو، ایک بوسہ، ان سب سے محروم رہ کر میں اپنے مریض دماغ کی تاریک پہنائیوں میں بھٹکتی ہوئی مر جاؤں گی اور میری کوئی چیخ، کوئی فریاد، کوئی درد کسی کے دل کو نہ ہلا سکے گا!

یکایک میں نے کملا کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔

پتہ نہیں کتنی دیر تک میں سر جھکائے اُن کے ٹیبل پہ بیٹھا رہا۔ میں نے دیکھا تو نہیں، لیکن محسوس ضرور کیا کہ وہ بڈھا اُٹھا۔ اُس کے ساتھ وہ لڑکی بھی اُٹھی۔ اور وہ دونوں آہستہ آہستہ وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ پھر بھی میں نے پلٹ کر اُن کی طرف نہیں دیکھا۔ شام گہری ہوگئی۔ بادل گھر کر آگئے۔ ٹپاٹپ بوندیں برسنے لگیں۔ بارش کی بوچھاڑ تیز ہوگئی۔ یکایک میں ٹیبل سے اُٹھا اور ٹیکسی کرایہ پر لے کر میرین ڈرائیو کی طرف چلا گیا۔ میں نے ٹیکسی والے سے کہا کہ وہ ٹیکسی آہستہ آہستہ چلائے کیونکہ مجھے شدید جھٹکا لگا تھا۔ اور میں آج جلد اپنے کوارٹر میں واپس نہ جانا چاہتا تھا۔

تھوڑی دُور جانے کے بعد پھر میں نے اُسی بڈھے اور اس کی بیٹی کو میرین ڈرائیو

کے بندھ پر بارش میں بھیگتے ہوئے دیکھا۔ لڑکی ننگے پاؤں چل رہی تھی۔ اور بارش میں بھیگ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ اُس کا بُڈھا باپ اُس کے سینڈل ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے چل رہا تھا اور اُس کے کپڑے سر سے پاؤں تک پانی میں بھیگ چکے تھے۔

میں نے ٹیکسی روکی اور پٹ کھول کر اُس سے کہا۔ "مجھے معاف کیجیے۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ آپ کو کہیں جانا ہے۔ میں پہنچا دُوں گا۔"

بُڈھا بولا۔ "کہیں جانا نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے۔ مون سون کی برستی بارش میں اسے سیر کرایا کرو۔ اس سے دماغ کو ٹھنڈک پہنچتی ہے اس لئے۔ . . ."

وہ چُپ ہو گیا۔ یکایک لڑکی میری طرف دیکھ کر مُسکرائی۔ اُسے مُسکراتا دیکھ کر میں بھی مُسکرا دیا۔ کیونکہ اگر نہ مُسکراتا تو شاید رو پڑتا۔ پھر میں نے جلدی سے ٹیکسی کا پٹ بند کیا۔ اور ٹیکسی والے کو جلدی سے چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم دُور جا رہے تھے۔ وہ بُڈھا اور اُس کی لڑکی بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اُس برستے آسمان کے نیچے دو اُداس پیکر کھوئے ہوئے اس گونگی گناہ گار عقل والی دُنیا میں دھیرے دھیرے سر جُھکائے چل رہے تھے . . . .

گلشن نے کافی کے پیلے سے اپنے ہاتھ الگ کر لئے۔ کافی ٹھنڈی ہو چکی

تھی۔ اُس نے اُداس لہجہ میں مجھ سے پوچھا۔

"آؤ چلیں۔"

ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُس مُسکرانے والی لڑکی کی طرف دیکھے بغیر کافے سے باہر نکل گئے۔

کرشن چندر

۱۴-۸-۵۹

اندھیرے کا ساتھی

پھول وتی نے آدم قد آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا اور آئینے نے اُس سے کہا۔

" تم بہت خوبصورت ہو۔ تمہارے نین کٹوروں میں شراب کی سی مستی یوں چھائی رہتی ہے کہ پروہیشن پولیس تمہیں کسی وقت بھی شُبہ میں گرفتار کر سکتی ہے۔ تمہارے گلابی ہونٹ پھولوں کی وہ پنکھڑیاں ہیں، جن پہ شہد کی مکھی دھوکا کھا کر کبھی بھی بیٹھ سکتی ہے۔ تمہاری چال جیسے پانی کی اِٹھلاتی ہوئی لہر، آواز جیسے فضا میں لچکتی ہوئی قوس و قزح کی کمان، قد جیسے .....

تم وہ عورت ہو جس کے لئے شاعر شعر کہتے ہیں۔ سیاستدان جھُوٹ بولتے ہیں۔ تاجر بلیک مارکیٹ کرتے ہیں اور مولوی اور پنڈت، ماتھا رگڑ رگڑ کر خدا کو یاد کرتے ہیں۔ تمہارے لئے اِنسان نے کیڑوں سے ریشم مانگا۔ بھُوری مٹی سے کانچ پیدا کیا۔ دھرتی کی چھاتی میں گھُس کر سونا حاصل کیا اور سمندر میں ڈوب کر موتی تلاش کئے۔ تمہارے لئے انسان نے گھر بنایا گھر کے گرد باغ لگایا۔ باغ میں

پھول کھلائے اور پھولوں کو توڑ کر تمہارے بالوں میں ٹانک دیا۔ تم جو ہر انسان کی آرزو ہو، ہر آرزو کی خوشبو ہو، ہر خوشبو کا صلہ ہو۔ تم آج کیوں رو رہی ہو؟

پھول دتی نے اپنی بڑی بڑی ڈبڈبائی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور سسک سسک کر کہا۔

ایسا ہی تھا تو پھر انہوں نے مجھے کیوں مارا؟ یہ پھول ایسے رخسار کس نے چانٹے مار مار کر لال کر دیئے؟ کیا یہ بھی آئینے کا دھوکا ہے؟

میں کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ آئینے نے کہا۔ جو کچھ تم ہو۔ جو تم پہ گذر رہی ہے۔ وہ سب میرے عکس میں موجود ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ کچھ اور بھی۔ کیونکہ میں صرف ماضی نہیں ہوں، تمہارا مستقبل بھی ہوں اگر غور سے مجھے دیکھو گی تو تمہیں وہ بھی نظر آئے گا جو آگے آنے والا ہے مجھے لوگوں سے بھی شکوہ ہے۔ وہ جیوتشیوں کے پاس جاتے ہیں اور مجھ سے کچھ نہیں پوچھتے۔ اگر وہ دن میں صرف ایک بار مجھے غور سے دیکھ لیا کریں تو انہیں کہیں جانے کی ضرورت نہ پڑے۔

آگے کیا ہونے والا ہے ـــــ؟ پھول دتی کی پھٹی پھٹی آنکھیں متوحش نگاہوں سے آئینے کو دیکھنے لگیں ـــــ آگے کیا ہونے والا ہے؟ اس سے پہلے تو انہوں نے مجھے کبھی چانٹا نہ مارا تھا۔ کبھی بھول کے بھی کوئی کڑوی بات نہ کہی تھی ابھی چھ مہینے تو ہماری شادی کو ہوئے ہیں۔ آج سے تین ماہ پہلے تو ہم کشمیر میں تھے۔ ہنی مون منا رہے تھے۔ تمہیں یاد نہیں ہے۔ ہم وہاں کتنے خوش تھے؟

پھول وتی نے غور سے آئینے میں دیکھا اور یکایک کانچ کی سطح اس طرح متلاطم ہوگئی، جیسے ہوا کے جھونکے سے چادرِ آب لہرا جاتی ہے.....

سبز ڈھلوان کے ساتھ ساتھ فیروزہ پوری نالہ بہہ رہا تھا۔ جب پانی ڈھلوان سے بہتا ہے تو چھوٹے چھوٹے نیلے نیلے پتھر اُس کے ساتھ بہتے ہیں۔ پانی پھیلتا ہے تو مچھلیوں کی کمر لچکتی ہے اور کوئی کسی کی لچکتی ہوئی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ہے اور کوئی گھبرا کے پلٹ کے کسی کے سینے سے لگ کے خوشی سے سسکنے لگتا ہے خوشی کے بھی آنسو ہوتے ہیں۔ پھول دتی کے غم کے آنسوؤں میں وہ خوشی کے آنسو چھلک اٹھے۔ ہائے کیسے پیارے دن تھے وہ! ڈھلوان پہ اخروٹ کے درختوں پہ چھوٹے چھوٹے سبز اخروٹ لٹک رہے تھے اور سطح زمین پہ ابخوں کے لاکھوں نیلے نیلے پھول کھلے ہوئے تھے اور اپنی آنکھیں کھول کے محبت کے دیوانوں کو دیکھ رہے تھے ہر آنکھ اک آئینہ حیران، ہر سانس محبت کی خوشبو سے لرزاں!

دمکتی ہوئی چاندنی میں پانی کے کنارے بیٹھے بیٹھے جب کوئی ٹراؤٹ مچھلی چمک اٹھتی ہے اور پھسلتے ہوئے کہیں چلی جاتی۔ تو پھول دتی حیران ہو کر اپنے آپ سے پوچھتی۔ یہ مچھلی کہاں جا رہی ہے؟ کیا اس دنیا میں ہر کسی کا کوئی محبوب ہے؟ جس کے پاس سب کچھ تج کے نظریں جھکا کے چلا جانا ہوتا ہے۔ ایسا ہی تھا تو وہ اتنے دن اپنے محبوب کے بغیر کیسے رہی؟ کیسی

خاموشی سنسان غیر متلاطم زندگی تھی وہ؟ ہاتھوں کے لمس سے بیگانہ۔ آنکھوں کے سوال سے ناآشنا، دل کی خلش سے اجنبی۔ پھول دتی کا دل آسودہ جذبات سے لبریز ہوگیا اور اُس نے سوچا۔ اس سے آگے کچھ نہیں ہے اور اُس نے ایک لمبی سانس لے کر اپنا چہرہ اپنے خاوند کے کوٹ میں چھپالیا۔

اور گردھاری نے اُسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ کل ہم گل مرگ جائیں گے۔

پھول دتی نے کوٹ کے کالر سے سر اُٹھا کر اخروٹ کے درختوں سے پرے گل مرگ کے پہاڑ کو دیکھا۔ گُل مرگ کا جنگل چاندنی میں سویا پڑا تھا۔ اور اس سوتے ہوئے جنگل کی چوٹی پر پہاڑ کے پیالے میں گل مرگ تھا۔

گل مرگ کا پیالہ گویا اُن کی خوشبوؤں کا لبریز پیالہ تھا۔ وہ پیالہ نہ تھا۔ محبت کا ہالہ تھا جس نے اُن دونوں رُوحوں کو اپنے مرکز میں لے لیا تھا۔ جب محبّت آتی ہے تو اور کوئی نہیں رہتا۔ کوئی سیاح نہیں رہتا اور کوئی مقام نہیں رہتا کوئی واقف کار نہیں رہتا اور کسی دُوسرے سے کوئی رشتہ نہیں رہتا۔ محبّت محبت کرنے والوں کو بالکل اکیلا چھوڑ دیتی ہے۔ اس دُنیا میں رہتے ہوتے بھی وہ اس دنیا سے دُور ہو جاتے ہیں۔ یہ ساری دھرتی گویا صرف اُن دونوں کی ہو جاتی ہے۔ محبت کے بعد پھول صرف اُن دونوں کے لیے مہکتے ہیں۔ لوگ بازاروں میں صرف اُن کے لئے چلتے ہیں۔ لکڑہارے جنگل میں لکڑیاں، اخروٹ پھول اور پھل صرف اُن کے لئے لاتے ہیں۔ آسمان پر بادل اُن کے لئے اُڑتے

ہیں اور زمین پر وہ اکیلا اجنبی مانند کسی پگڈنڈی پر چلتا ہوا صرف اُن کے لئے گیت گاتا ہے۔

الپیتھر کی جھیل پر برف کے تودوں کے درمیان بیٹھے بیٹھے پھُول دتی نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ چاروں طرف برف پوش پہاڑوں کی چوٹیاں جو تبّت کو دیکھتی ہیں، بھوٹان کو دیکھتی ہیں۔ سکم کو دیکھتی ہیں لداخ کو دیکھتی ہیں — یہ چوٹیاں جو کسی کو نہیں دیکھتی ہیں۔ صرف محبّت کے دو متوالوں کو دیکھتی ہیں، جو الپیتھر کی جھیل کے کنارے برف کے تودوں کے درمیان ایک سرے سے لگ کر بیٹھے ہیں کتنے ہزاروں، لاکھوں سال کے بعد یہ لمحہ آیا ہے۔ جب ہر چوٹی کے سنہرے سپنے پُورے ہوتے ہیں۔ اب ان چوٹیوں کو کسی کا انتظار نہ رہے گا۔

آنے والے آ گئے۔

مگر وقت تھمتا نہیں ہے۔ تھمتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسی لئے آنے والے آتے ہیں اور آ کر چلے جاتے ہیں۔ وہ تین ماہ ہنی مون کے کتنی جلدی ختم ہو گئے۔

پھُول دتی نے مایوس ہو کر دونوں ہاتھ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ لئے اور آئینے کی طرف دیکھ کر حسرت سے پوُچھا۔ کہاں گئے وہ دن؟ اتنی جلدی کیسے ختم ہو گئے؟ وہ محبّت اور امیدوں کے جگمگاتے ہوتے دن کہاں چلے گئے؟ اور اُن کے جاتے ہی یہ زور کا چانٹا۔ ۔ ۔ ۔ ۔!!!

پھُول وتی نے بے اختیار اپنا ہاتھ اپنے پھُول سے نازک رُخسار پر رکھ لیا۔ جہاں ابھی تک گرہ دھاری کے چلنٹے کے نشان تھے۔ وہ دن اس لئے ختم ہو گئے کیونکہ پیسے ختم ہو گئے تھے۔

ہنی مون کے لئے تمہارے باپ کے دیئے ہوئے پیسے ختم ہو گئے تھے۔ اور گرہ دھاری کی چھٹی بھی ختم ہو گئی تھی اور گرم میدانوں کی کڑی محنت اُسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ .....

آئینے نے جواب دیا۔

چھ مہینوں میں ہی وہ پھر مجھ سے پیسے مانگنے لگے، میں کہتے ہیں اپنے باپ سے جا کے پیسے مانگ کے لاؤ۔

کیا مُنہ لے کے جاؤں۔ شادی پہ اتنا کچھ تو انہوں نے دیا تھا اس گھر کے بھنڈار بھر دیئے تھے۔

جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ چانٹا کھانا پڑے گا۔

پھُول وتی ڈر کے مارے کانپ اٹھی۔ اُس نے آئینے سے مُنہ موڑ لیا۔

گرہ دھاری کوئی بُرا آدمی نہیں تھا وہ ایک خوش اخلاق خوش رو، خوش مزاج نوجوان تھا اور ایک چھوٹے سے سرکاری دفتر میں ایک چھوٹا سا سرکاری افسر تھا۔ تنخواہ بھی چھوٹی تھی۔ بس ساڑھے تین سو روپے اور اُوپر کی آمدنی

بالکل نہ تھی۔ اور گردھاری نوجوان تھا۔ نیا نیا ملازم ہوا تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ جوانی کی ہزاروں آرزوئیں اور اُمنگیں ایسی ہوتی ہیں جو معصوم ہوتے ہوئے بھی ساڑھے تین سو میں پُوری نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے چھ ماہ ہی میں گردھاری پر ایک ہزار روپیہ قرض ہوگیا۔

اب کیسے قرض ہوگیا؟ اس کی تفصیل تو وہ بتا نہیں سکتا ہے۔ اُسے کوئی بڑی لت بھی نہیں تھی۔ دُھت شراب۔ وہ نہیں پیتا تھا۔ بس کبھی کبھی چکھ لیتا تھا۔ جُوئے کی بھی اُسے عادت نہ تھی۔ یونہی رمی میں پیسہ دو پیسہ پوائنٹ وہ ہار جاتا تھا۔ ریس کا اُسے چسکہ نہ تھا۔ سٹہ وہ کھیلتا نہ تھا۔ مارفیا کے انجکشن وہ نہیں لیتا تھا۔ کوٹھوں پر وہ نہیں جاتا تھا وہ ایک سیدھا سادھا آرام پسند سکون طلب نوجوان تھا۔ جسے اپنی بیوی سے محبّت تھی۔ جسے اچھے کپڑوں کا شوق تھا۔ وہ ایک سلیقے سے سجے ہوئے گھر میں رہنا چاہتا تھا۔ جس کے ڈرائنگ روم میں خوبصورت پردے جھُول رہے ہوں اور نازک منقش صراحیوں میں سے نرگسی پھُول جھانکتے ہوں اور اُس کی بیوی سنہری چوڑیوں سے مزیّن کلائی بڑھا کر اپنی نازک اُنگلیوں سے ریڈیو گرام کا سوئچ کھولتی ہو۔

کیسے معصوم خواب تھے اُس کے کتنے اُدھورے سپنے۔ جو محض اس لئے پورے نہیں ہوتے تھے کہ اُس کی بیوی میکے جاکر اپنے باپ سے روپیہ

مانگنے سے احتراز کرتی تھی۔

آخر اس میں ہے کیا؟ آخر اس کا لکھ پتی باپ اتنی دولت اپنے سر پر اُٹھا کر چتا میں لے جائے گا۔ ہزار دو ہزار روپیہ ہوتا ہی کیا ہے۔ مانگتے ہی اس کا باپ اُسے یوں چٹکی بجاتے دے دے گا۔

مگر یہ جاہل لڑکی ہے کہ مانتی ہی نہیں!

اِس لئے چانٹا! دو چار مُکّے اور گھونسے۔ ایک بار بالوں کو پکڑ کر گھسیٹنا۔ یہی انتہائی بڑی باتیں ہیں۔ مگر کبھی کبھی ضروری بھی ہو جاتی ہیں اور کون سا میں کسی بڑے کام کے لئے پیسہ مانگ رہا ہوں شراب کے لئے، جوئے کے لئے، سٹّے کے لئے، ریس بازی یا رنڈی بازی کے لئے مانگ رہا ہوں۔ جو یہ اس شدّت سے میکے جانے سے انکار کر رہی ہے۔ برابر روئے جا رہی ہے۔ کتنی پیاری مگر کتنی بے وقوف لڑکی ہے!

مگر میکے تو اُسے جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ قرضہ کیسے چُکایا جائے گا۔ اور یہ ضروری سامان کیسے آئے گا۔

چند روز کی ہَیں ہَیں توُ تُو کے بعد پھُول دتی کو اپنے میکے جانا ہی پڑا۔ وہ وہاں پہ دو مہینے رہی۔ اُس کے باپ نے اُسے پانچ ہزار روپیہ دیا۔ اور اُس سے کہہ دیا کہ یہ روپیہ میں آخری بار دے رہا ہوں مجھے لالچی داماد پسند نہیں ہے۔ نہ ہی میں گِردھاری کو ایسا سمجھتا تھا۔ تم لوگوں کو ساڑھے تین سو

میں گُزارہ کرنا چاہیئے۔

دو ماہ کے بعد جب پھُول دتّی پانچ ہزار روپیہ لے کے لوٹی۔ تو گر دھاری نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ جھُوٹ مُوٹ نہیں۔ اور محض روپے کی خاطر سے نہیں۔ واقعی وہ اپنی بیوی کی طویل غیر حاضری سے اُداس ہو چلا تھا۔ اُسے اپنی بیوی سے شدید محبّت تھی۔ کبھی کبھی اُس کی غیر حاضری میں اُس نے یہ بھی سوچا تھا، اُس نے خواہ مخواہ اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا اگر وہ لوگ تھوڑی سی بچت کر لیتے۔ تھوڑا سا اپنا خرچ کم کر دیتے تو ممکن تھا کہ قرضہ اُتر جاتا۔ کئی بار اُس نے یوں بھی سوچا۔ اچھا اب کے وہ روپیہ لے آئے۔ آئندہ میں کبھی اپنی بیوی کو پریشان نہیں کروں گا۔ واقعی بُرا لگتا ہے۔ کسی سے روپیہ مانگنا۔ چاہے وُہ اپنا سُسر ہی کیوں نہ ہو۔

اس واقعہ کے بعد دو سال بڑے اچھّے گزرے۔ گردھاری نے اپنا قرضہ اُتار دیا اور باقی کے روپے بڑی خوش سلیقی سے آہستہ آہستہ خرچ کئے۔ کیونکہ اُسے کوئی بڑی لت تو تھی نہیں۔ مگر بڑی لت نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ آخر پانچ ہزار ہوتے ہی کتنے ہیں! ذرا غور فرمایئے۔ پانچ کے آگے تین صفر۔ اور تھوڑے سے عرصہ کے بعد صفر ہی صفر۔ روپیہ تو شعلہ ہے۔ چند لمحہ بھڑک کر روشنی دیتا ہے پھر راکھ ہو جاتا ہے۔ اگر روپیہ ایک درخت ہوتا جو ہر سال پھل دیتا تو پھُول دتّی اور گردھاری کے گھر کا آنگن کتنا خوشگوار ہوتا؟ مگر جانے ان

سائنسدانوں کو کیا ہوا ہے! بنجر چاند پہ جانے کے لئے راکٹ بناتے ہیں۔ مگر معمولی گھروں میں روپے کے درخت نہیں اُگاتے۔

اور اب تو پھول دتی کی گود میں ایک خوبصورت بچہ بھی کھیلتا تھا۔ گردھاری کو اپنے لڑکے سے بڑا پیار تھا۔ اُس نے اُس کی پرورش کے لئے ایک آیا بھی رکھ لی تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنے بچے میں مگن تھے۔ پھول دتی بڑی سلیقے والی عورت تھی۔ وہ اپنا چھوٹا سا گھر صاف شفاف اور ستھرا رکھتی۔ خود بھی ہر وقت سجی سجائی رہتی۔ اُس کے ڈرائنگ روم میں کہیں کوئی دھبہ نظر نہ آتا تھا۔ ڈرائنگ ٹیبل کا کانچ ہر وقت چمکتا نظر آتا۔ اُس کی ساڑھی کبھی میلی نہ ہوتی۔ بال کبھی اُلجھے نہ ہوتے۔ گلدانوں میں کبھی باسی پھول نہ ہوتے۔ وہ لوگ ہر تیسرے روز پکچر دیکھتے تھے۔ ہر ساتویں روز مائی لارڈ ہوٹل میں کھانا کھاتے تھے۔ مائی لارڈ ہوٹل میں اُن کی جگہ مخصوص تھی۔ غربی کوٹ میں نرم نرم گدوں والا بلوصوفہ دھلیا کے پھولوں سے بھرا ہوا گلدستہ اور احتراماً جھکا ہوا بیرا زندگی کتنی خوبصورت ہو جاتی ہے جب کوئی سامنے احتراماً جھکتا ہے۔ چاہے چند لمحوں ہی کے لئے جھکے۔ چاہے چند پیسوں ہی کے لئے جھکے۔ مگر یہ لوگ یوں جھکتے کیوں ہیں اور دوسرے لوگ انہیں جھکا کے خوش کیوں ہوتے ہیں؟ شاید کسی میں اس سوال کا جواب نہ مل سکے گا۔

دو سال کے بعد گھر میں پھر جھگڑا شروع ہونے لگا۔ دھیرے دھیرے

بالوں میں تلخی آنے لگی۔ وہ پانچ ہزار روپے کب کے خرچ ہو چکے تھے۔ ایک
پھر قرضہ بڑھنے لگا تھا۔ پھول دتی ہزار سگھڑاپے سے خرچ کرتی۔ مگر قرضہ
تھا کہ بڑھا جا رہا تھا۔ گردھاری یوں تو بے حد شریف بلکہ مثالی خاوند تھا۔ مگر زندگی
کی چند آسائشیں ایسی ہوتی ہیں، جن کے بغیر کوئی شریف آدمی کیسے رہ سکتا ہے؟
پھر منّے کا خرچ تھا۔ منّے کی آیا کا خرچ تھا۔ اس پر گردھاری نے گھر کے لئے
قسطوں پر ایک ریفریجریٹر خرید لیا تھا۔ ریفریجریٹر کتنے کام کی چیز ہے۔ گرمیوں میں
برف کی لگی ہوئی بیئر کی بوتل کتنا مزہ دیتی ہے۔ یخ کی طرح ٹھنڈا دودھ کتنا
لطف دیتا ہے۔ ریفریجریٹر میں رکھی ہوئی سبزیاں خراب نہیں ہوتیں۔ جب چاہے
برف کھائیے۔ جب چاہے آئس کریم بنائیے۔ شربت پیجیے۔ برف کی قاشوں پہ
وہسکی ڈال کر زندگی کا لطف دوبالا کیجیے۔ گردھاری کو عرصہ سے احساس تھا۔ کہ
اس کا گھر فرج کے بغیر سونا سونا سا ہے۔ اس لئے وہ بیوی کے منع کرنے پر
بھی ایک روز فریج قسطوں پر خرید کر لے آیا۔

ریفریجریٹر کے آنے سے پھول دتی کو گھر میں بڑا آرام ملا۔ گھر میں آسائش کا
ایک اور کونہ ابھر آیا اور گھر کی خوبصورتی میں ایک اور رنگ کا اضافہ ہوا۔ مگر اب
مشکل یہ آن پڑی کہ ہر ماہ تنخواہ میں سے اس کے لئے قسط کٹ جاتی تھی۔ اس
کے اوپر منّے اور آیا کا خرچ تھا۔ ہاتھ تنگ ہوتے لگا۔ قرضہ بڑھنے لگا۔ ہوتے
ہوتے بیچ میں ایسا ہو گیا کہ گردھاری ریفریجریٹر کی چار قسطیں نہ دے سکا۔ اِدھر

کمپنی والوں کا نوٹس آ گیا۔ انہوں نے اب تک۔ اُس پر بہت مہربانی کی تھی مگر اب وہ مزید برداشت نہیں کر سکتے تھے اگر ایک ماہ کے اندر اندر گردھاری نے انہیں گزشتہ چار قسطیں ادا نہ کیں تو کمپنی ریفریجریٹر اُٹھا کے لے جائے گی۔

لے جائیں ——! پھول دتی بڑی نخوت سے بولی —— ہمیں نہیں چاہیئے۔

واہ —— ! گردھاری فوراً بولا۔ اور یہ جو آٹھ قسطیں میں دے چکا ہوں۔ وہ بے کار میں ضائع جائیں گی۔

تو آٹھ ماہ ہم نے اُسے استعمال بھی تو کیا ہے؟

جب لوگ گھر میں فریج نہیں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟

،ہمیں لوگوں کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ یہ گھر ہمارا ہے، لوگوں کا نہیں ہے۔ پھول دتی اُسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

مگر گردھاری نہ مانا۔ اس پر پھول دتی نے کہا۔

" تو گھر کا خرچ کم کر دو۔"

کیا کم کر دوں ——؟ گردھاری گرج کر بولا۔

ہم ہر تیسرے [illegible] جاتے ہیں۔ اب ہفتہ میں ایک روز جایا کریں گے۔ پہلے ٹیکسی پر جاتے تھے۔ اب بس میں چلے جائیں گے۔

زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس روپے بچ جائیں گے۔ اس سے کیا ہوگا؟

مجھے ہر ماہ نئی ساڑھی کی کیا ضرورت ہے؟ میرے پاس پہلے کی بہت سی ہیں۔

تم نہیں جانتیں۔ ہر ماہ فیشن بدلتا رہتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ گردھاری کی بیوی.....

آپ کے پاس سوٹ تو بہت ہیں۔ اگر نیا سوٹ نہ سلواتے تو ڈیڑھ سو روپیہ بچ جاتا ـــ پھول دتی سہم کر بولی۔

تو کیا ننگا گھوموں ـــ؟ گردھاری چیخ کر بولا ـــ اِک ذرا سی آسائشِ زندگی میں چاہتا ہوں۔ کوئی عیب نہیں پال رکھا نے میں۔ کوئی برائی مجھ میں نہیں ہے۔ بس ذرا سلیقے سے میں رہنا چاہتا ہوں۔ اس میں تم مین میخ نکالتی ہو۔

میں کہاں میخ نکالتی ہوں میں تو بس یہ کہتی ہوں کہ انسان کو اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے۔

دو ہزار سال سے وہی چادر میں پاؤں پھیلانے کی بات میں سن رہا ہوں۔ بھگوان کرے ساری دُنیا کی چادریں پھٹ جائیں۔ تم عورتوں کے پاس کوئی اور بات کہنے کو نہیں ہے۔ جب بات کرتی ہو یہی چادر سامنے لے آتی ہو۔

یہ ـــ یہ چادر نہیں ہے۔ انسان کی ساری اُمیدوں کا کفن ہے!

پھول دتی چپ ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد سر جھکا کے بولی۔ میں ایف۔ اے پاس ہوں۔ کہیں نوکری کرا دو مجھے کسی آفس میں۔

بہت ہوا تو پچھتّر روپلے لے آؤگی ہر مہینے اُس سے کیا ہوگا پھر گھر کون دیکھے گا ؟ کیا بات کرتی ہو!

پھُول دتی نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ تو پھر یہ طے ہے کہ ریفریجریٹر واپس کر دیا جائے۔ اور گھر کا خرچ کم کر دیا جائے۔

گردھاری نے کہا۔ کچھ کم نہ ہوگا۔ ریفریجریٹر بھی واپس نہیں جائے گا —— تمہیں میکے جانا پڑے گا۔

میں نہیں جاؤں گی۔

تمہارے پتاجی اتنے غریب نہیں ہیں کہ تین ہزار روپے نہ دے سکیں۔ ایک صرف تین سال میں کام رِل جائے گا۔

آپ کو معلوم نہیں ہے، پتاجی کو بزنس میں پچھلے سال دس لاکھ کا نقصان ہوا ہے۔ اُن کی حالت بہت پتلی ہے۔ اب وہ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ تین ہزار کی رقم ہوتی ہی کیا ہے؟

نہیں۔ میں میکے نہیں جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی۔ مگر اب اپنے باپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔

یکایک گردھاری کو غصّہ آگیا۔ وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اُس نے زور سے پھُول دتی کے ایک لات ماری۔ پھُول دتی تیورا کے گر پڑی۔

ایک ماہ کے بعد جب پھُول دتی اپنے میکے سے لوٹی تو تین ہزار روپیہ

اُس کے پرس میں تھا۔ مگر اب کے وہ پچھلی مرتبہ کی طرح خوش خوش گھر سے
نہ آئی تھی۔ اب کے اُس کا رنگ اُڑا اُڑا تھا۔ اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔
پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ پتا جی نے اُس کی بڑی بے عزتی کی۔ اُسے روپے
تو دے دیئے۔ مگر بڑی خوشامد کے بعد دیئے اور اُس سے کہہ دیا کہ اب کے
اگر وہ روپے کا مطالبہ کرنے آئی تو اُسے دھکّے مار کر گھر سے باہر نکال دیا جائے
گا۔ پھول دتی رو رو کر کہنے لگی۔ اب میرا وہ گھر نہیں ہے۔ میرا گھر تو یہ ہے۔ اُس
گھر پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ تم میرے جیون ساتھی ہو۔ بھگوان کے لئے مجھے میری
نظروں میں مت گراؤ۔

گردھاری بھی آبدیدہ ہوگیا۔ اُس نے اپنی بیوی کو گلے سے لگا لیا۔ کیسے ظالم
لوگ ہیں یہ۔ انہیں اپنی بیٹی سے زیادہ اپنا روپیہ پیارا ہے!

مگر میں تو اب پرائی ہو چکی۔ میرا ان پہ اب حق بھی کیا ہے؟

ہاں ہاں! ٹھیک ہے۔ جلنے دو۔ میں خود تمہیں وہاں کبھی نہ بھیجوں گا۔

بات آئی گئی۔ قصّہ ختم ہوگیا۔ قرضہ اُتر گیا۔ ریفریجریٹر ہمیشہ کے لئے گھر میں
آگیا۔ میاں بیوی اور مُنّا گھر میں ہنسی خوشی سے رہنے لگے۔ ڈیڑھ سال کے
قریب پھر مزے میں گزرا۔ میاں بیوی ہر تیسرے روز سینما جاتے۔ ہر ساتویں دن
مائی لارڈ میں کھانا کھاتے۔ ہر ماہ نئی ساڑھی آتی۔ مُنّا کے لئے عمدہ سے عمدہ
کپڑے۔

مگر اب کے پھول دتی بہت محتاط ہو گئی۔ گھر کا خرچ بہت احتیاط سے کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی سینما کی کلاس ہیں کٹنی کاٹ جاتی۔ کبھی ٹیکسی کے بجائے خاوند کو بس ہی میں لے آتی۔ کسی ماہ اُس کا سوٹ کسی ماہ اپنی ساڑھی نہ خریدتی۔ گھر بڑی خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔

مگر گردھاری کچھ خوش نہیں تھا۔ یوں تو اُس کی زندگی میں سب کچھ موجود تھا۔ خوبصورت بیوی۔ پیار کرنے والی بیوی۔ ایک پیارا بچہ۔ پیارا سا منّا۔ پیارا سا گھر صاف ستھرے سلیقے سے سجا ہوا۔ ریڈیو گرام۔ ریفریجریٹر..... بس کمی تھی تو صرف ایک کار کی۔ عرصے سے اُس نے چھوٹی سی گاڑی دیکھ رکھی تھی۔ چھوٹی سی گاڑی۔ ٹُبک اور سیاہ۔ سیکنڈ ہینڈ اور صرف پانچ ہزار روپے۔ ایسی گاڑی آج کل آٹھ ہزار میں بھی نہ مل سکتی تھی۔ اپنی گاڑی ہو تو خرچ میں کتنی بچت ہو جاتی ہے۔ بس کا کرایہ ٹیکسی کا خرچ۔ کیو پر کھڑے کھڑے جو خون سوکھتا ہے۔ انسان کتنی مصیبتوں سے بچ جاتا ہے۔ ایک گیلن ڈالو اور تیس میل سفر کر لو۔ بس میں کپڑے جلد میلے ہوتے ہیں۔ گاڑی آ جائے گی تو بڑے بڑے افسروں کو بُلایا جا سکے گا۔ رات کی دعوت ڈھنگ سے کی جا سکے گی۔ بڑے لوگوں سے ملنے کے لئے مناسب ڈھنگ سے جا سکیں گے۔ گاڑی ہو گی تو ترقی بھی ہو جائے گی۔ انسان کی ترقی کے لئے گاڑی بے حد ضروری چیز ہے۔ انسان محنتی ہو، نہ ہو، دیانت دار ہو نہ ہو۔ لیکن اگر اُس کے پاس ایک گاڑی ہے...

کئی دنوں سے گردھاری پھول وتی کو لکچر پلا رہا تھا۔ پھول وتی سب سمجھتی تھی۔ مگر کچھ نہ بولتی تھی۔ آخر ایک دن جب گردھاری نے اُسے مارنے کے لئے پھر ہاتھ اُٹھا لیا تو وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

آخر تم یہی چاہتے ہو نا کہ میں میکے جاؤں۔ اور تمہاری گاڑی کے لئے پانچ ہزار اپنے باپ سے لے آؤں؟

میرا مطلب یہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ گردھاری آنا کانی کرتے ہوئے بولا۔ اگر وہ پانچ ہزار قرض دے دیں تو میں آہستہ آہستہ انہیں ادا کر دوں گا۔ گاڑی خریدنے کے بعد تو کوئی بھی اس گاڑی پر قرض دے دے گا۔ مگر گاڑی کو گروی کیوں رکھا جائے۔ آخر میں اُن کا داماد ہوں۔ کیا وہ میرے لئے اتنا سا بھی۔ ۔ ۔ ؟

پھول وتی بات کاٹ کر بولی۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔ مارنے پیٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی میکے چلی جاتی ہوں اور پتا جی سے پیسے لے کے آتی ہوں۔

گردھاری کو بڑی حیرت ہوئی۔ کچھ صدمہ بھی ہوا۔ کچھ مسرت بھی ہوئی۔ بیٹھے بٹھائے مار پیٹ کے بغیر کام بن گیا۔ پھول وتی واقعی بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ایسی بیوی کہاں ملے گی؟ سات جنم ڈھونڈنے پر بھی کہیں ایسا جیون ساتھی ملتا ہے؟

پھول وتی کو رخصت ہوتے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ گردھاری بہت اُداس

تھا۔ اُسے اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ حالانکہ وہ اُس کے کام سے میکے جاتی تھی۔ مگر جب جاتی تھی۔ گردھاری اداس ہو جاتا تھا۔ آج اتفاق سے موسم بھی ایسا تھا۔ آسمان پر اودے اودے بادل چھا رہے تھے۔ موسم گلابی، فضا شرابی، پھر ہلکا ہلکا ترشح ہونے لگا اور بارش برس کر جو تھمی ——— تو ہوا کے ایسے خوشگوار جھونکے آنے لگے کہ گردھاری کے دل میں بار بار پھول دتی کی تصویر اُبھرنے لگی۔ اس وقت وہ یہاں ہوتی تو سمندر کے کنارے گھومنے کو چلتے دوسرے شو کا سینما دیکھتے اور آدھی رات کے وقت محبت میں مخمور جھومتی ہوتی ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر آتے۔ ... آج حالانکہ گھر وہی ہے۔ مگر کس قدر سونا سونا سا ..... وہی خوشنما ڈرائنگ روم ہے۔ وہی ریشمی پردے ہیں۔ جھلملاتے ہوئے فانوسوں میں وہی دھیمی دھیمی روشنیاں ہیں۔ مگر پھول دتی کہاں ہے؟

ایک لمحہ کے لئے گردھاری کا ضمیر تڑپنے لگا۔ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ اُسے اپنے آپ کو بدل دینا چاہیئے۔ آخر ایک کار کے بغیر بھی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ دُنیا میں کروڑوں آدمی ایسے ہیں جو ریفریجریٹر اور گاڑی کے بغیر ایک خوبصورت زندگی بسر کرتے ہیں اور پھول دتی تو نہایت ہی پیاری سی لڑکی ہے۔ اُس کے ساتھ تو جھونپڑے میں بھی زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ بے شک وہ انتہائی ظالم انسان ہے۔ وہ کبھی بھی پھول دتی کو اُس کے میکے نہیں بھیجے گا۔ آج اس وقت وہ یہاں ہوتی .....

وہ اسی طرح باتیں کرتا رہا اور اپنے گہرے دوست شیام سُندر سے اپنے دل کا دُکھ بیان کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ دونوں دوست وہسکی پیتے رہے اور اُداس ہوگئے۔ کیونکہ موسم ہی ایسا تھا جس میں اُداسی بڑی سُہانی اور رُومانی معلوم ہوتی ہے۔

شیام سُندر نے کہا۔ آؤ دوست! کہیں باہر چلیں۔

.میں کہیں نہیں جاؤں گا ـــــ گرد ھاری نے رنجور ہو کر کہا۔ مجھے اس وقت پھُول دتی یاد آرہی ہے۔

میرے ساتھ چلو ـــــ شیام سُندر نے اُسے آنکھ مار کر کہا ـــــ میں تمہیں ایک ایسی جگہ لے چلتا ہوں۔ جہاں تمہارا سارا غم غلط ہو جائے گا!

کہاں لے جاؤ گے ـــــ؟

ارے تم میرے ساتھ چلو تو سہی ۔

نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تمہیں معلوم ہے۔ میں آج تک کسی ایسی جگہ نہیں گیا۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔ ہائے! میری پھُول دتی ۔

شیام سندر نے رازدارانہ لہجہ میں اُس سے کہا ـــــ ایک لڑکی کو میں جانتا ہوں ۔ اگر اُسے تم ایک نظر دیکھ لو۔

مگر گردھاری نہیں مانا۔ ناچار شیام سُندر اکیلا ہی وہاں سے چلا گیا۔ کیونکہ موسم بہت گلابی تھا اور جب شیام سُندر چلا گیا تو گردھاری اور بھی اُداس

ہو گیا۔ اب اُسے ہر طرف پھول دتی نظر آنے لگی اور ہر سانس میں اُس کی مہک آنے لگی اور ہر لحظہ رنجور اور اُداس ہوتا گیا۔ آخر اُس سے رہا نہ گیا۔ اُس کی اُداسی گہری ہو چکی تھی اور اُس کی وہسکی ختم ہو چکی تھی اور اب عورت کی آغوش کے سوائے غم غلط کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ اس لئے گردھاری اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس طرح اپنی رُوح کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

بہت دیر تک وہ شہر کی گلیوں میں اُس کے بدنام کوچوں اور بازاروں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اُسے تلاش تھی۔ ایک ایسی لڑکی کی جو نئی ہو۔ نسبتاً اجنبی ہو۔ خوبصورت ہو۔ جوان ہو۔ مہربان ہو۔ مزاج کی اچھی ہو۔ طبیعت کی عمدہ ہو۔ شرمیلی ہو۔ گالیاں نہ بکتی ہو۔ سنجیدہ اور مہذب ہو یعنی بیوی بھی ہو اور بازاری بھی ہو۔ حیرت ہے۔ عقلمند سے عقلمند مرد بھی ایسے موقعوں پر کتنا بے وقوف ثابت ہوتا ہے۔

ایک دلال اُسے دیر تک اِدھر اُدھر گھماتے پھرتا رہا۔ ٹیکسی پر اُس کے اب تک سولہ روپے خرچ ہو چکے تھے۔ اگر آج اُس کی اپنی گاڑی ہوتی تو یہ خرچ تو نہ ہوتا۔ اُس نے پھول دتی کو میکے بھیج دیا۔ گاڑی زندگی کے لئے کیسے حد ضروری ہے۔

ٹیکسی شہر کی سڑکوں پر گذرتے ہوئے ایک خوبصورت یا غنچے سے

گھرے ہوئے دو منزلہ مکان کے سامنے رُکی۔ دلال نے اُس سے کہا۔
بس صاحب! دنیا میں اس سے بہتر مال کہیں نہیں ہے۔ میں آپ کو سورگ کی حد پہ لے آیا ہوں۔ آپ سیدھے اندر چلے جائیے۔ سیڑھیاں چڑھ کر مکان کی دوسری منزل پہ چلے جائیے۔ دروازے پہ بیل لگی ہے بٹن دبا کر انتظار کیجئے۔ وہ آپ کے لئے انتظار کر رہی ہے۔ میں نے سب بندوبست کر دیا ہے، صاحب سلام!

گردھاری نے ٹیکسی کو چلتا کر دیا۔ اُس نے انتظام کرنے والے کو پانچ روپے کی بخشش دی۔ اس کے بعد وہ پُر اُمید اور مسرور، پرانی وضع کے بنگلے کے باغیچے میں داخل ہو گیا۔ باغیچے میں سے جوہی اور رات کی رانی کے پھولوں کی خوشبو اُس کے نتھنوں میں سرایت کرنے لگی۔ اور وہ جوان رات کے اُس پہلے پُر اسرار سفر کے لئے تازہ دم ہوتا گیا۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُس نے پُرانے پیتل کے فانوس کو دیکھا۔ سیڑھیوں کے کنارے دو رویہ کر اُس قسم کے شاداب پھولوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

واقعی یہ لوگ اچھا ذوق رکھتے ہیں —— اُس نے اپنے دل میں سوچا۔
سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ چوبی تختوں والے برآمدے میں پہنچا تو اُس کے دل سے پھول دتی کا ہر خیال دُور ہو چکا تھا اور اب وہ ہر طرح رات کے

انجانے سفر کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

اُس نے خوشی سے سیٹی بجاتے ہوئے نئے ارمان کو دعوت دی اور جلدی سے بند دروازے کا برقی بٹن دبا دیا۔

تھوڑی دیر میں دروازہ کھُلا اور ایک خوبصورت لڑکی مسکراتے ہوئے اُس کا استقبال کرنے کے لئے آگے بڑھی!

آگے بڑھتے بڑھتے یکایک اُسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

دروازے پر پھُول دتی کھڑی تھی!

کرشن چندر

۹-۵-۵۹

بیمار باپ

اب یہ بات دوستوں پر کھُل چکی تھی کہ مہتہ چاہتا ہے کہ اُس کا باپ جلد سے جلد مر جائے۔

چندر کانت مہتہ ہمارا دوست تھا اور ہمارا ہمسایہ بھی تھا وہ دُبلا پتلا اُونچے لانبے قد کا ادھیڑ عمر کا ایک دلال تھا جو کرایہ کے مکانوں یا اونرشپ فلیٹوں کی دلالی کرتا تھا اور پالی پارک میں رہتا تھا۔

پالی پارک کے بنگلوں میں جتنے کرایہ دار آتے تھے۔ اُسی کی معرفت آتے تھے اور جو نئے بنگلے بن رہے تھے اُس کے بھی کرایہ دار اُسی کی معرفت آئیں گے۔ اس کا بھی ہمیں علم تھا کیونکہ چندر کانت مہتہ سیٹھ خوب چند کو خوب اچھی طرح سے جانتا تھا اور سیٹھ خوب چند ان تمام بنگلوں کا مالک تھا۔ اسی لئے چندر کانت مہتہ نے دن رات خوشامد کر کے اور مسکہ لگا لگا کے سیٹھ خوب چند کو اپنی مُٹھی میں لے لیا تھا۔ حالانکہ سیٹھ خوب چند بے حد بدزبان اور تیز مزاج سیٹھ تھا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ کھردری سے کھردری

طبیعت بھی مکھن لگانے سے چکنی ہو جاتی ہے! اور اگر نہیں جانتے ہیں۔ تو ایک دن جان گے!

بہر حال چندر کانت مہتہ کو زمانے کی تلخیوں نے یہ گرُ اچھی طرح سے سکھا دیا تھا۔ مگر اس دُنیا میں اکیلی خوشامد کافی نہیں ہے۔ نئے مکانوں کی تعمیر بھی ضروری ہے۔ اگر نئے مکان نہیں بنیں گے تو نئے کرایہ دار اُن میں کیسے آکر بسیں گے اور چندر کانت مہتہ دلالی کیسے کرے گا۔ کیونکہ ان دنوں مکانوں کی قلت کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جو کرایہ دار ایک مکان میں آکر بس گیا بس وہاں سے جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔ پچھلے زمانے میں سُنتا ہے کہ کرایہ دار انتہائی شریف اور مہذب ہوا کرتے تھے۔ مالک مکان کے ایک ہی نوٹس پر گھر خالی کر کے چلے جایا کرتے تھے۔ آج کل کے کرایہ دار دس بارہ مقدمہ کرنے پر بھی نہیں نکلتے۔ کوئی انسانیت ہے؟ آخر چندر کانت مہتہ کہاں جاتے؟ اُسے ہر ماہ اپنے گھر کے خرچ کے لئے ایک ہزار روپیہ چاہیئے اور مکانوں کی دلالی سے اور دُوسرے چھوٹے موٹے کاموں سے اُسے مشکل سے چار پانچ سو کی آمدنی ہوتی تھی۔ باقی رقم وہ ہر ماہ کہاں سے لاتے؟ اس لئے وہ بے چارہ ہمیشہ مقروض رہتا ہے۔ کیونکہ چندر کانت مہتہ کے پاس ایک خوبصورت گُڑیا سی بیوی ہے اور ایک خوبصورت ننھّی سی کار ہے۔ اس لئے جب وہ بڑے پیار سے "بلبی" کہہ کر آواز دیتا ہے تو یہ اکثر پتہ نہیں چلتا

کہ وہ اپنی بیوی کو بُلا رہا ہے یا اپنی کار کو! جب ایک گھر میں دو خوبصورت چیزیں جمع ہو جائیں تو اسی طرح گڈ مڈ ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جب صاحب کا مُنہ دونوں کو ایک ہی نام سے پکارنے کا عادی ہو۔ اس وقت ہم لوگ جو اُس کے ہمسایہ ہونے کا شرف رکھتے ہیں، محض اُس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کرتے ہیں کہ روئے سخن کدھر ہے؟ —— آج میں نے بے بی کے لئے ایک عمدہ ساڑھی خریدی ہے۔ ظاہر ہے اس وقت بے بی سے مطلب اُس کی بیوی سے ہے۔ ورنہ گاڑی کو ساڑھی کون پہناتا ہے۔ ساڑھی کو گاڑی میں تو سبھی بٹھاتے ہیں۔ لیکن گاڑی کو ساڑھی کون پہناتا ہے؟

یا وہ جب ہم سے یوں ہم کلام ہوتا ہے "ابھی کل ہی کی بات ہے کہ میں اپنی بے بی کو دھو رہا تھا کہ اتنے میں . . . . ." ہم سمجھ جاتے ہیں کہ اس وقت بے بی سے مُراد گاڑی ہے۔ بیوی نہیں ہے لیکن کبھی کبھی بڑا گھپلا ہوتا ہے۔ "میری بے بی کو چوٹ آ گئی!" اب سمجھ میں نہیں آتا کہ مسز مہتہ کے پاؤں میں موچ آ گئی ہے یا کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے؟ یا "آج راستے میں بے بی نے مجھے بہت پریشان کیا۔" اب راستے میں بیوی بھی پریشان کر سکتی ہے اور گاڑی بھی۔ اور ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ کیا بات ہوئی؟ بیوی کے مزاج کا پارہ تیز تھا یا گاڑی کی بیٹری ڈاؤن تھی؟ ایسے موقعوں پر بھی انتہائی سنجیدگی سے سر ہلا کے صرف ہوں ہاں کہہ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

بے بی کے علاوہ چندر کانت مہتہ کا پسندیدہ موضوع اُس کے باپ کی علالت ہے اُس کا باپ چمن مہتہ پچاس برس کا بڈھا ہے۔ بوڑھوں کی طرح دُبلا پتلا بلکہ اُس سے کہیں زیادہ سُوکھا۔ اپنے بیٹے ہی کی طرح چمن مہتہ لانبا ہے۔ مگر اس کی آواز اس شدید علالت کے باوجود پاٹ دار اور کراری ہے بیٹے کی آواز میٹھی اور لچکدار ہے۔ چندر کانت کی آواز سُنکر ہی خیال ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کو یا تو دلال ہونا چاہیئے یا شہد کی مکھیاں پالنے کا بیوپار کرنا چاہیئے۔ مگر اُس کے باپ چمن مہتہ کی کراری آواز سے اُس کے دولت مند ہونے اور کنجوس ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ باپ بیٹے دونوں ایک بنگلے میں پالی پارک میں رہتے ہیں چندر کانت مہتہ اور مسز مہتہ دونوں دن رات بُڈھے کی خدمت میں لگے رہتے ہیں بڈھے کا سارا جسم سوکھ گیا ہے۔ پاؤں پہ ورم آگیا ہے۔ آنکھوں سے بہت کم دکھائی دینے لگا ہے مگر پھر بھی سانس کی آمدورفت جاری ہے اور گردن اس طرح سُوکھ گئی ہے کہ سانس نرخرے سے آتا جاتا دکھائی دیتا ہے۔ بُڈھا اس پہ بھی زندہ ہے اور جیئے جاتا ہے اور بیماری کا مقابلہ کئے جاتا ہے اس کے دو بیٹے اور بھی ہیں۔ لیکن اب وہ اپنے بُڈھے باپ کی خدمت نہیں کرتے۔ کیونکہ بُڈھا تو دس سال سے بیمار ہے اور وہ دونوں بیٹے پہلے چار سالوں میں ہی اُس کی خدمت کرتے کرتے تھک گئے۔ ہر جذبے کی ایک میعاد ہوتی ہے۔ ایک عمر ہوتی ہے۔ جہاں پر پہنچ کر وہ دم توڑ دیتا ہے۔ ان دو بیٹوں کے ساتھ یہی ہوا

آخر میں بُڈھے نے چندر کانت مہنہ کی خدمت سے خوش ہو کے اپنے ان دونوں بیٹوں کو جائیداد سے عاق کر دیا۔ کیونکہ یہ جائیداد دیشتی نہ تھی۔ بُڈھے کی خود کی پیدا کردہ تھی۔ دوسرے دونوں بیٹوں کو اس کا بہت غم تھا اور وہ دونوں غم و غصّہ میں آکر اپنے بھائی چندر کانت کو موردالزام ٹھہراتے تھے اور اکثر لوگوں سے کہتے پھرتے تھے کہ ہمارے بھائی نے جائیداد کے لالچ میں آکر ہمارا گلا کاٹا ہے۔ چندر کانت نہایت خاموشی سے اُن کی باتیں، اُن کے طعنے سُنتا اور پھر اپنے بڈھے باپ کی خدمت میں لگ جاتا ہے۔

آج چھ سال سے وہ اپنے بُڈھے باپ کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ کوئی فرمانبردار سے فرمانبردار بیٹا بھی اپنے شری باپ کی اسقدر خدمت نہیں کر سکتا۔ جس قدر خدمت چندر کانت کرتا تھا۔ اور وہ بڑے فخر سے اپنے دوستوں میں بیان کیا کرتا تھا۔ چندر کانت خاصہ مذہبی آدمی بھی تھا۔ اور اُسے لکچر سُننے اور سُنانے کا بھی شوق تھا۔ اکثر دھارمک جلسوں میں وہ رامائن سے مثالیں دیتے ہوئے اپنی تقریر میں ماں باپ کی خدمت کی اہمیت میں زور دیتے ہوئے اپنے بڈھے باپ کی علالت کا ضرور ذکر کرتا تھا۔ لوگ اس کی اس بے ضرور سی کمزوری کو معاف کر دیتے تھے۔ آخر جو بیٹا اتنے سال باپ کی خدمت کرے گا کیا اُسے اپنی خدمت کے صلے میں ستائش کے دو لفظ کہنے کا بھی حق نہیں؟

ٹی بی کے علاوہ چندر کانت مہتہ کا پسندیدہ موضوع اُس کے باپ کی علالت ہے اُس کا باپ، چمن مہتہ پچاس برس کا بڈھا ہے۔ بوڑھوں کی طرح دُبلا پتلا بلکہ اُس سے کہیں زیادہ سُوکھا۔ اپنے بیٹے ہی کی طرح چمن مہتہ لانبا ہے۔ مگر اس کی آواز اس شدید علالت کے باوجود پاٹ دار اور کراری ہے بیٹے کی آواز میٹھی اور لچکدار ہے۔ چندر کانت کی آواز سُنکر یہی خیال ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کو یا تو دلال ہونا چاہیئے یا شہد کی مکھیاں پالنے کا بیوپار کرنا چاہیئے۔ مگر اُس کے باپ، چمن مہتہ کی کراری آواز سے اُس کے دولت مند ہونے اور کنجوس ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ باپ بیٹے دونوں ایک بنگلے میں پالی پارک میں رہتے ہیں چندر کانت مہتہ اور مسز مہتہ دونوں دن رات بُڈھے کی خدمت میں لگے رہتے ہیں بڈھے کا سارا جسم سوکھ گیا ہے۔ پاؤں پہ ورم آگیا ہے۔ آنکھوں سے بہت کم دکھائی دینے لگا ہے مگر پھر بھی سانس کی آمدورفت جاری ہے اور گردن اس طرح سُوکھ گئی ہے کہ سانس نرخرے سے آتا جاتا دکھائی دیتا ہے۔ بُڈھا اس پہ بھی زندہ ہے اور جیئے جاتا ہے اور بیماری کا مقابلہ کئے جاتا ہے اس کے دو بیٹے اور بھی ہیں۔ لیکن اب وہ اپنے بُڈھے باپ کی خدمت نہیں کرتے۔ کیونکہ بُڈھا تو دس سال سے بیمار ہے اور وہ دونوں بیٹے پہلے چار سالوں میں ہی اُس کی خدمت کرتے کرتے تھک گئے۔ ہر جذبے کی ایک میعاد ہوتی ہے۔ ایک عمر ہوتی ہے۔ جہاں پر پہنچ کر وہ دم توڑ دیتا ہے۔ ان دو بیٹوں کے ساتھ یہی ہوا

آخر میں بُڈھے نے چندر کانت مہنہ کی خدمت سے خوش ہو کے اپنے ان دونوں بیٹوں کو جائیداد سے عاق کر دیا۔ کیونکہ یہ جائیداد پشتی نہ تھی۔ بُڈھے کی خود کی پیدا کردہ تھی۔ دوسرے دونوں بیٹوں کو اس کا بہت غم تھا اور وہ دونوں غم و غصہ میں آکر اپنے بھائی چندر کانت کو موردالزام ٹھہراتے تھے اور اکثر لوگوں سے کہتے پھرتے تھے کہ ہمارے بھائی نے جائیداد کے لالچ میں آکر ہمارا گلا کاٹا ہے۔ چندر کانت نہایت خاموشی سے اُن کی باتیں؛ اُن کے طعنے سُنتا اور پھر اپنے بڈھے باپ کی خدمت میں لگ جاتا ہے۔

آج چھ سال سے وہ اپنے بُڈھے باپ کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ کوئی فرمانبردار سے فرمانبردار بیٹا بھی اپنے شری باپ کی اسقدر خدمت نہیں کر سکتا۔ جس قدر خدمت چندر کانت کرتا تھا۔ اور وہ بڑے فخر سے اپنے دوستوں میں بیان کیا کرتا تھا۔ چندر کانت خاصہ مذہبی آدمی بھی تھا۔ اور اُسے لکچر سُننے اور سُنانے کا بھی شوق تھا۔ اکثر دھارمک مجلسوں میں وہ رامائن سے مثالیں دیتے ہوئے اپنی تقریر میں ماں باپ کی خدمت کی اہمیت میں زور دیتے ہوئے اپنے بڈھے باپ کی علالت کا ضرور ذکر کرتا تھا۔ لوگ اس کی اس بے ضروری کمزوری کو معاف کر دیتے تھے۔ آخر جو بیٹا اتنے سال باپ کی خدمت کرے گا کیا اُسے اپنی خدمت کے صلے میں ستائش کے دو لفظ کہنے کا بھی حق نہیں؟

چندر کانت مہتہ اور مسز مہتہ بڈھے باپ کے خریدے ہوئے بنگلے میں رہتے تھے۔ کسی زمانے میں بڈھے باپ کو پرانے ٹائپ کے فرنیچر جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اِس لئے اُس کا بنگلہ اس قسم کے فرنیچر سے پٹا پڑا تھا۔ مسز مہتہ اور اپنے بیٹے کو بڈھے نے دو کمرے دے رکھے تھے۔ باقی سب کمروں میں اُس کا سامان پڑا تھا اور کوئی چیز اُس کی بغیر اجازت سے اِدھر سے اُدھر نہ ہو سکتی تھی۔ مسز مہتہ اس بات سے بہت کڑھتی تھیں اور کبھی کبھار اپنی سہیلیوں سے گفتگو کرتے وقت اُن کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے: "دیکھنا ایک دن میں اس بنگلے کو کیسا سجاؤں گی؟"

ورنہ مسز مہتہ ایسے معاملوں میں بے حد محتاط رہتی تھیں اور بڈھے کو بھی اس بات کا پورا یقین تھا کہ اُن کی بہو اور اُس کا بیٹا دوسرے کے ناخلف بیٹوں کی طرح نہیں ہے اور سچے دل سے اور سچی لگن سے بڈھے باپ کی خدمت کرتے ہیں۔

گو بڈھے نے اپنے پہلے بیٹوں کو عاق کر دیا تھا۔ پھر بھی گھر پہ اُس کا پورا پورا کنٹرول تھا۔ تمام ضروری کاغذات، ہنڈیاں، مسکات زیور اور نقد روپیہ وہ ایک تجوری میں بند کر کے رکھتا تھا۔ تجوری بڈھے کے کمرے میں رہتی تھی۔ اور چابیاں بڈھے کے بستر کے سرہانے کے نیچے اور بڈھا اس قدر شکی مزاج

تھا کہ اگر اُس کا اپنا بیٹا بھی کبھی بند تجوریوں کی طرف دیکھ لیتا تو بُڈھے کی آنکھوں میں شک و شبہ کا طوفان اُٹھنے لگتا۔ اور اُس کے سانس کی آمد و رفت تیز ہو جاتی۔

اپنی علالت کے دوران میں بُڈھا آہستہ آہستہ کمزور ہوتا گیا۔ پہلے تو وہ بستر سے اُٹھ سکتا تھا اور دروازہ بند کر کے اپنے بیٹے اور بہو کو باہر نکال کے تجوری کھولتا تھا اور تجوری کے اندر دولت کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا۔ جب بستر سے اُٹھنا ہی اُس کے لئے ممکن نہ رہا۔ اُس دن کے بعد تجوری کبھی نہ کھلی

بُڈھے نے یوں تو کبھی کچھ نہ کہا۔ لیکن بُڈھے کی آنکھوں کی حریص چمک کہے دیتی تھی۔ کہ تجوری کی طرف کوئی جائے بھی نہیں۔ بہو نے غالباً اس کا ارادہ بھانپ لیا تھا۔ اس لئے اُس نے اور بیٹے نے تجوری کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ کبھی کبھار شاید چور نگاہوں سے وہ اس تجوری کو دیکھ لیتے ہوں گے۔ جس کے اندر اُن کا مستقبل بند تھا۔ مگر صاف کھلے انداز سے اُسے دیکھنے کی جرأت کبھی نہ ہوئی تھی۔ چندر کانت مہتہ تو بُڈھے کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا اور بُڈھے کے پاس بیٹھ کر اُس کے پاؤں دابنے لگتا۔ اور بُڈھا ہولے ہولے کھانسنے لگتا۔ مگر بڈھا کچھ بھی کہتا۔ اکثر اُس کی بے بس اور مجبور نگاہیں تجوری ہی کی طرف چلی جاتیں اور پھر وہیں جم جاتیں۔ پھر وُں

گھنٹوں وہ اپنی تجوری کو دیکھا کرتا۔ جس میں اُس کی زندگی کا اثاثہ بند تھا۔ گو اب وہ اُسے ہاتھ تو نہ لگا سکتا تھا اور نہ کھول کر دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اُسے اِس بات کا بھروسہ تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے، نہ تجوری کھُلے گی، نہ اُس کی زندگی میں اُس کی کمائی پر کوئی ہاتھ صاف کر سکے گا!

دھیرے دھیرے بُڈھا کمزور ہوتا گیا۔ دھیرے دھیرے تجوری پر گرد و غبار کی تہیں چڑھتی گئیں۔ اور وہ منحوس بدصورت زنگ آلود تجوری ایک سنگین قبر کی طرح تاریک نظر آنے لگی۔ مکڑی نے اُس پر ایک بڑا جالا بنا لیا تھا۔ اور خود بُڈھا بھی اپنے میلے بستر پر پڑا ہوا نحیف سانس لے رہا تھا۔

مگر چندر کانت جتنا اپنے بڈھے باپ کی خصلت سے واقف تھا۔ اُس نے کبھی بھول کر بھی ایک بار بھی اپنے بُڈّھے باپ سے روپے نہیں مانگے۔ خود دِن رات محنت کی۔ قرضہ لیا۔ اِدھر اُدھر سے مانگ مانگ کے اپنے دن کاٹے۔ مگر تجوری کو کھولنے کی استدعا کبھی نہ کی۔ اُسے معلوم تھا۔ کہ یہ استدعا اُس کا وقار اُس کے باپ کی نظروں میں ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گی۔ اُس کے دونوں بھائی جائیداد سے بے دخل ہو چکے تھے۔ اب تو یہ ساری دولت اُس کے حِصّہ میں آنے والی تھی۔ صرف بُڈّھے کے مرنے کا انتظار تھا۔ لیکن چندر کانت نے کبھی بڈھے پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ کس شدّت سے، کس سچائی سے، کس لگن سے وہ بڈھے کی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ بظاہر وہ ہر لحظہ بڈھے کے سامنے اور

اپنے دوستوں کے سامنے بڈھے کی صحت کی دعائیں مانگا کرتا۔ جس لگن سے وہ بڈھے کی خدمت کرتا تھا، اسی شدت سے اُس کے دل میں بڈھے کی موت کی آرزو اپنے پاؤں پھیلائے جاتی۔ کبھی کبھی تو شدت انتظار سے اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ اور اُس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے اور نگاہیں جُھکا لیتا۔ مبادا کہیں دل کے اندر چھپا ہوا جذبہ آنکھوں کے چور دروازے سے جُھک کر باہر نکل جائے۔ کبھی کبھی تو وفور جذبات سے اُس کا دل گھبرانے لگتا۔ ایک مکڑی بستر پر ہے۔ ایک مکڑی تجوری پر ہے۔ کیوں نہیں وہ ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے ان جالوں کو توڑ کر اُس دولت پر قبضہ کر لیتا۔ جو ہر اخلاقی اعتبار سے اب اُس کی ہو چکی تھی۔

مگر نہیں! ٹھہر! اے دل بے تاب ٹھہر! اگر پھل خود ہی پک کر اُس کی جھولی میں گرنے والا ہو تو درخت پر چڑھ کر شاخوں سے اُلجھنے کی کیا ضرورت ہے؟

کیا کیا اُس کے دل میں ارمان تھے۔ وہ ان نئے پُرانے مکانوں کی دلالی سے عاجز آچکا تھا۔ وہ ایک بڑا دھندا کرنا چاہتا تھا۔ وہ سٹّے کے داؤ پر ایک ہی بار بیس ہزار لگا کر لاکھوں کمانا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کا یہ مجہول باپ اب تک زندہ تھا اور زندہ چلا آرہا تھا۔ ایک ہی سانس تھی جو گلے میں اٹکی ہوئی تھی۔ مگر کسی طرح یہ سانس باہر نہ نکلتا تھا۔ کبھی کبھی یہ سانس خود اسے اپنے گلے میں پھانسی کی رسّی کی طرح چُبھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

بیٹے کی خدمت میں اُس کے انہماک میں اک اس طرح کا جذبہ بلکہ تشکر شامل

تھا جیسے اُس کی رُوح کا ذرّہ ذرّہ پچاس سالہ باپ کی ضد کے خلاف احتجاج کر رہا ہو۔ کیوں نہیں مر جاتے تم۔ میرے باپ۔ کیوں نہیں تم اس جسم کا مکان خالی کر دیتے۔ کرایہ دار آتے ہیں۔ کرایہ دار جاتے ہیں۔ مگر تم اپنا فلیٹ کیوں نہیں خالی کرتے؟ پچاس سال ہو گئے تمہیں اس جسم میں رہتے ہوئے۔ اب جاؤ تاکہ میں دلالی کر سکوں اور نیا بزنس کھول سکوں۔

مگر بڈھے کو معلوم تھا کہ جسم ایک ایسا فلیٹ ہے جو ایک بار خالی کر دینے پر کبھی بسایا نہیں جا سکتا اس لئے وہ گزرتے ہوئے وقت کی طرف رینگتے ہوتے بھی وقت کے ایک ایک پل سے لڑائی کر رہا تھا اور اپنی زندگی پر جھپٹ رہا تھا۔ اُس کی گرسنہ نگاہوں میں زندہ رہنے کی ایسی تمنّا تھی۔ کہ موت بھی اُس کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتی تھی۔

پھر وہ دن آ گیا۔ جب بڈھا بے حد کمزور ہو گیا۔ اُس کے کان بہرے ہو گئے۔ اُس کی زبان بند ہو گئی اُس کے ہاتھ اور پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ نبض جواب دے گئی۔ ڈاکٹروں نے کہا۔ بڈھا اب چند لمحوں کا مہمان ہے۔

فرمانبردار بیٹے نے وفورِ غم سے اپنے آنسو پونچھے اور پہلی بار بند تجوری کی طرف جرأت آزما نگاہوں سے دیکھا۔

اور جس وقت بیٹے نے تجوری کی طرف دیکھا۔ اُس لمحہ باپ نے بیٹے کی طرف دیکھا اور بیٹے کی وہ نگاہ اک تیر کی طرح باپ کے سینے میں گھُستی چلی

گئی اور یکا یک اُسے ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے باپ کی طرف محسوس کی جانے والی محبت کا رنگ و روغن نوچ لیا اور اُس کے بیٹے کے ننگے جذبات کو اُس کے سامنے کھڑا کر دیا۔ بڈھے کے جسم میں ایک خفیف سی جھرجھری آئی اور اُس کی بے بس مجبور آنکھوں کی حریصانہ چمک غم و غصہ کے شعلے میں تڑپنے لگی۔ اب جسم خاکی کے کسی کونے میں شاید کہیں جان باقی نہ تھی۔ صرف ماتھا گرم تھا اور سانس چل رہی تھی۔ صرف آنکھیں روشن تھیں اور اُن میں ایک غیر معمولی چمک تھی جو ہر لحظہ بڑھتی جاتی تھی جیسے لَو ختم ہونے سے پہلے ایک بار بلند ہو جائے۔

بیٹے نے باپ کی نگاہ نہیں دیکھی۔ ورنہ وہ اُسی وقت گھبرا جاتا۔ اُس وقت وہ اپنے ہمسایوں اور دوستوں کے گروہ میں کھڑا اس کمرے میں آہستہ آہستہ کسی کو چندن لانے کو کہہ رہا تھا۔ کسی سے پنڈت بُلانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ کسی کو گھی کا آرڈر دے رہا تھا۔ کسی کو نئے کفن کا۔ کسی کو چتا کی لکڑیوں کا.... دھیرے دھیرے انتہائی رازدارانہ لہجے میں وہ اپنے دوستوں سے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان وہ اس طرح بات کر رہا تھا جیسے اُس کا باپ مُردہ ہو اور آج سے وہ اس گھر کا مالک ہو۔ اس کے بولنے کے لہجے میں اور اس کے چلنے کے انداز میں غیر شعوری طور پہ ایک جھلک پیدا ہو جاتی تھی۔

سب دوست آ جا رہے تھے۔ عورتیں رونے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ بہو کو دلاسہ دے رہی تھیں۔ لوگ مختلف گروپوں میں بنگلے کے اندر اور باہر کھڑے

مختلف باتیں کر رہے تھے اور بڈھے کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے ۔ جس میں اب ڈاکٹر کے کہنے کے بموجب صرف، چند لمحوں کی دیر تھی ۔ وہ چند لمحے چند منٹ بھی گزر گئے ۔ چند منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہوتے گئے ۔ بڈھا اسی حالت میں لیٹا رہا ۔ اسی طرح اُس کا سانس چل رہا تھا ۔ نبض واپس نہ آئی تھی ۔ لیکن آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی تھی ۔

ایک بار جو بڈھے نے تجوری سے نظر ہٹا کر شعلہ بار نگاہوں سے بیٹے کی طرف دیکھا تو بیٹا یکایک گھبرا گیا ۔ یکایک اُسے معلوم ہوا کہ جس راز کو اُس نے اتنے سال سے اپنے باپ کی نظروں سے چھپا کر رکھا تھا وہ آج ہی ایک ہی نگاہ میں افشا ہو گیا ہے ۔ اب دونوں کی نگاہیں ایک، دوسرے پر تھیں ۔ باپ کی بیٹے پر ۔ بیٹے کی باپ پر ۔ دونوں دشمن آمنے سامنے کھڑے تھے ۔ بیچ میں دولت تھی ۔

جب صبح کے پانچ بج گئے تو ڈاکٹر کو بڈھے کی نبض واپس آتی ہوئی معلوم ہوئی ۔ سب لوگوں نے بیٹے کو اور بہو کو مبارکباد دی ۔ ہمسائے رات بھر کے جگے ہوتے تھے ۔ سب لوگ اپنے گھروں پر جا کے سو گئے !

صبح نو بجے کے قریب بڈھے کے بنگلہ سے آہ و بکا کی صدائیں بلند ہوئیں اور گھبرا کر نہیں بلکہ اطمینان سے اپنے گھروں سے نکلے ۔ سب کے چہروں پر ایک عجیب سی ۔ تھی ۔ آخر وہ گھڑی آن پہنچی ۔ جس کا سب کو انتظار تھا ۔ ہم سب ۔

لوگ بھاگے بھاگے بنگلے کے دروازے تک پہنچے اور ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

کیا بڈھا مر گیا ——؟

بنگلے کے پٹھان دربان نے سر ہلا کے کہا۔

نہیں جناب، بڈھا تو زندہ ہے۔ اُس کا بیٹا مر گیا ہے۔ ابھی ابھی اُس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

ایک ہزار چار سو بہتّر لڑکیاں

رمیش نے پرویز سے کہا "آج رات کا کھانا کھانے کے بعد لڑکیاں دیکھنے چلیں گے۔"

پرویز نے حیرت سے رمیش کی طرف دیکھا۔ غالباً وہ رمیش کو ایسا آدمی نہیں سمجھتا تھا۔ انجم کو نسبتاً کم حیرت ہوئی۔ کیونکہ اُس کے دل میں شروع ہی سے شبہ تھا کہ رمیش ایسا آدمی ہے۔ بہر حال دونوں نے کھانا کھاتے کھاتے ہاتھ کھینچ لیا۔

پرویز نے کہا "آج رات ہی کی کیا شرط ہے۔ پھر کبھی سہی آج رات میں شعر کہنے کے موڈ میں ہوں!"

رمیش نے کہا "پہلے لڑکیاں دیکھ لو۔ پھر شعر کہہ لینا۔ غزل پیدا ہو جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں پرسوں کلکتے سے جا رہا ہوں۔ اور صرف آج کی شام خالی ہے۔ اس لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

انجم، جواب تک چُپ تھا، رمیش کی طرف شبہ سے گھورتے ہوئے بولا۔

"رمیش کیا بات ہے۔ سچ سچ بتاؤ۔ تم کوئی بات چھپا رہے ہو۔"

رمیش نے کہا۔ "تو سنو! آج صبح ساڑھے دس بجے میں تمہارے گھر کی جانب آ رہا تھا۔ پارک سرکس پر مجھے ٹیکسی مل گئی۔ میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر اُسے تمہارے گھر کا پتہ دیا۔ تم جانتے ہو میں ذرا آہستہ لہجے میں بات کرتا ہوں۔ اچھا جب ڈرائیور نے اچھی طرح نہ سُنا تھا۔ تو پھر اُس کا فرض تھا کہ مجھ سے دریافت کرتا کہ جی آپ کو کہاں جانا ہے اس کے بجائے اُس نے مجھ سے پوچھا "کیا کہا۔ آپ کو لڑکی چاہیئے ؟" اب تم ہی بتاؤ۔ صبح کے ساڑھے دس بجے اگر ایک ٹیکسی ڈرائیور مجھ سے جگہ دریافت کرنے کے بجائے لڑکی کے بارے میں دریافت کرے تو مجھے کچھ سوچنا چاہیئے یا نہیں ؟"

انجم نے مسکرا کر کہا۔ "لڑکیوں کے متعلق کچھ سوچنا نہیں چاہیئے۔ صبح کے ساڑھے دس بجے۔ نہ رات کے ساڑھے دس بجے۔ لڑکی صرف دیکھنے کی چیز ہے۔ سوچنے کی چیز نہیں ہے۔"

مگر پرویز کو معلوم تھا کہ ابھی بات ختم نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے اُس نے انجم کی بات اَن سُنی کر کے رمیش سے پوچھا "آگے چلو رمیش! میں دیکھ رہا ہوں کہ ابھی تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو!"

رمیش نے کہا۔ "اس کے بعد میں انجم کے گھر آیا۔ یہ حضرت غائب تھے۔ ٹیکسی میں نے چھوڑ دی تھی۔ پھر ٹیکسی کی تلاش میں نکلا۔ اگلے موڑ پر جہاں

انجم نے رمیش کی طرف، فاتحانہ انداز سے دیکھ کر کہا: "دیکھا میں نے لڑکی کا ذکر نہیں کیا۔"

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ بولا۔

"سمجھ گیا!"

رمیش نے انجم کی طرف، فاتحانہ نگاہوں سے دیکھا۔

"رمیش نے بیماری کے عالم میں کہا: "کہیں قریب، یں کوئی جگہ ہو تو وہیں لے چلو۔"

ڈرائیور نے وہیں گاڑی روک دی بولا: "تو اس میں چلے جلیئے وہ سامنے بلڈنگ میں۔"

اب جب بات سامنے آگئی تو وہ تینوں ہچکچائے۔ دونوں رمیش کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے کہہ رہے ہوں: "تم ہی نے پہل کی تھی۔ اب تم ہی آگے بڑھو۔"

ڈرائیور نے مسکرا کر کہا "گاڑی سے باہر نکلئے صاحب۔"

پرویز نے کہا: "ڈرائیور تمہارا نام کیا ہے؟"

"جان"

"تو جان سنو! ہم اندر نہیں جائیں گے۔ یہیں بلوا دو۔"

جان نے سانولے چھوکرے سے کہا: "نندی! یال سنوار تا چھوڑ دے اور اندر جا کر تین لڑکیاں لے آ۔"

نندی جلدی سے اُٹھ کر بلڈنگ کے اندر گیا۔ دو منٹ میں واپس آ گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے تین لڑکیاں آ گئیں۔ دو نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ایک نے فراک۔ میک اپ تینوں نے کیا ہوا تھا۔ بشاشت کسی کے چہرے پر نہ تھی۔ آتے ہی ایک لڑکی نے جو ذرا سینئر معلوم ہوتی تھی، اُن سے کہا۔

"صاحب جلدی سے بات کر لیجئے۔ ہم لوگ چالیس روپے لیتے ہیں۔"

پرویز خفا ہو کے بولا۔ "ہمیں کیا اجنبی سمجھ رکھا ہے۔ اس شہر میں بیس برس سے بھاڑ جھونک رہے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک بات کرو۔"

"اچھا تو بیس روپے کم دے دینا۔"

"واہ! کیا بات کرتی ہو۔ بیس روپے میں آدھے مہینے کا راشن آتا ہے۔ ایک پتلون سلتی ہے۔ تین قمیضیں تیار ہوتی ہیں۔"

انجم بولا۔ "اور وہسکی کی پوری بوتل ملتی ہے۔"

رمیش نے کہا: "تین روپے دیں گے۔"

لڑکیاں خفا ہو کر گالی دیتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

رمیش نے کہا۔ "گاڑی آگے بڑھاؤ جان!"

جان آہستہ سے گاڑی بڑھاتے ہوئے بولا۔ "صاحب لڑکیاں اچھی تھیں۔ سات روپے میں سودا ہو جاتا۔ سات روپے یا زیادہ سے زیادہ دس روپے میں۔"

"آگے چلو جی۔ کوئی اور دیکھیں گے۔" انجم نے کہا۔

دس قدم چل کر گاڑی پھر رُک گئی۔ جان نے کہا:۔

"نندی جاؤ۔ اندر سے لے آؤ۔ اور اب کے اُن سے کہہ دینا کہ سیدھی موٹر میں آ کے بیٹھ جائیں۔ صاحب لوگ اچھی طرح سے دیکھ سکیں گے۔"

نندی تین اور لڑکیاں لے آیا۔ وہ اندر آ کر بیٹھ گئیں۔ بیٹھتے بیٹھتے ایک لڑکی زور سے چیخی۔ انجم کے ہاتھ میں سُلگتا ہوا سگریٹ قصداً یا سہواً اُس کے بازو سے لگ گیا تھا۔ انجم معافی مانگنے لگا۔ وہ لڑکی خفا ہو کے بولی ـــــ

"ابھی پیسہ دیا نہیں۔ شرارت پہلے شروع کر دیا۔"

انجم بولا ـــــ "تم کیا مانگتا ہے؟"

وہ بولی ـــــ "بیس روپے ہر ایک کے۔"

رمیش بولا ـــــ "چار روپے ملیں گے۔"

وہ بولی ـــــ "پندرہ روپے۔"

رمیش بولا ـــــ "چار روپے آٹھ آنے۔"

وہ بولی۔ "دس روپے۔"

رمیش نے کہا۔ "تو نے پانچ روپے۔"

وہ بولی ـــــ "میں سانڈ کو بھیجتی ہوں۔" اور گاڑی سے اُتر کر دوسری دونوں لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئی۔

رمیش نے جان سے کہا۔ "گاڑی بڑھاؤ۔"

جان نے کہا۔ "دیکھئے ٹھہریئے! شاید سودا ہو جائے۔ سانڈ کو آنے دیجئے۔"

رمیش نے کہا "یہ سانڈ کون آ رہا ہے؟"

جان نے ہنس کر کہا۔ "صاحب یہ لڑکیاں کوٹھی خانہ کے منتظم کو سانڈ بولتی ہیں اپنی زبان میں۔"

پرویز نے کہا۔ "کس قدر حقیقت آمیز تصوّر ہے۔"

اتنے میں سانڈ آ گیا۔ ایک دُبلا پتلا سیاہ رنگ کا پنجابی شلوار پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پر چاقو کے نشان تھے۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"صاحب اندر تو آ کے دیکھئے۔ ایک سے ایک بڑھیا چیز موجود ہے۔ سودا بھی ہو جائے گا۔ آپ تشریف تو لائیے۔ آپ تو ہمارے ہم وطن معلوم ہوتے ہیں۔"

پرویز بولا۔ "جی قبلہ میں آپ کا ہم وطن نہیں ہوں۔ میں بہار کا رہنے والا ہوں۔ یہ (انجم کی طرف اشارہ کر کے) یہ حضرت مالیگاؤں کے ہیں۔ ہاں یہ صاحب (رمیش کی طرف اشارہ کر کے) آپ کے ہم وطن ہیں۔"

صاحبِ شلوار نے مسکرا کے کہا۔ "صاحب اس کام میں سبھی ہم وطن ہو جاتے ہیں۔ یہ کام ہی ایسا ہے۔ آپ اندر تو آئیے۔"

جان نے نندی سے کہا۔ "ان صاحب لوگ کو اندر لے جاؤ۔ اگر مال پسند نہ آیا تو حفاظت سے باہر لے آنا۔"

پنجابی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"آئیے!"

اندر ایک بڑے کمرے میں وہ لوگ لے جائے گئے۔ تھوڑی دیر میں پندرہ لڑکیوں کا ایک گروہ اندر آیا۔ اور اُن کے قریب سے مٹکتا ہوا دوسرے دروازے سے گزر گیا۔ صاحبِ شلوار نے کہا۔

"فرمائیے؟"

انجم نے کرسی پر بیٹھ کر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر کہا۔ "اور منگواؤ یہ مال پسند نہیں ہے۔"

"تو اور دیکھئے سرکار۔ چینی دیکھئے۔ جاپانی دیکھئے۔ پنجابن دیکھئے۔ بنگالن دیکھئے۔ ہر رنگ کا مال ہمارے یہاں ملتا ہے۔"

"لٹھا دیکھئے۔ ململ دیکھئے۔ کریپ دیکھئے۔ پاپلین دیکھئے۔" پرویز نے طنزاً آہستہ سے کہا۔

لڑکیوں کا دوسرا گروہ مٹی کے کھلونوں کی طرح ہمارے سامنے سے سرکتا ہوا گزر گیا۔ اب کے پچیس لڑکیاں گزریں۔ سانڈ نے کہا۔

"ایک بات بولتا ہوں صاحب! پہلے نمبر کا بھاؤ چھ روپے ہے۔ ایک بات بس۔ اور اب ان کا بھاؤ سات روپے ہے۔ اس سے ایک پائی کم نہ ہوگی۔"

"اور سیلز ٹیکس کیا ہوگا؟" رمیش نے کہا۔

سانڈ نے ہنس کے کہا۔"وہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ جو خوشی ہو دے دیجئے نہ ہو۔ نہ دیجئے۔"

رمیش نے کہا۔"چلو چلیں۔"

"کوئی پسند نہیں؟"

"نہیں۔"

"اچھا آپ کی مرضی۔ آپ تو ہمارے گاہک ہیں۔ پھر کبھی آیئے گا۔ ہم خدمت کے لیئے ہر وقت حاضر ہیں۔"

"ہر وقت" انجم بولا۔"تو گویا آپ اتوار کو بھی دوکان بند نہیں کرتے؟"

"جی نہیں۔ اتوار کے دن تو بہت رش رہتا ہے۔"

کوئی دروازے پر ہنسا۔ رمیش نے دیکھا۔ جان تھا۔ جان کہنے لگا۔"کوئی پسند نہیں آئی۔ صاحب آپ لوگوں کا ٹیسٹ (TEST) کیسا ہے؟ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔"

پرویز نے کہا۔"ہم لوگ بہت اونچا اڑتے ہیں جان! تم یہاں ذاتی طور پر۔ میرا مطلب۔ بطور خاص کسی کو نہیں جانتے؟"

جان نے کہا۔"میں ایسا کام نہیں کرتا صاحب! ہاں ایک لڑکی کیبنر ہے۔ اُسے جانتا ہوں۔ وہاں آپ کو لے چلتا ہوں۔"

پرپیچ سڑکوں اور گلیوں سے ہوتا ہوا وہ ایک گندے ہوٹل کے دروازے

پر رُک گیا۔ اور وہیں باہر سے چلا کے پوچھنے لگا ـــ" ارے بھاگرے۔ بھاگرے۔ کینتز کدھر ہے؟"

بھاگرا جلدی سے دھوتی سنبھالتا ہوا باہر آیا ـــ بولا ـــ" کون ہے، کون ہے۔ کون چلاّتا ہے؟" پھر جان کو دیکھ کر اُس کی جان میں جان آئی۔ بولا ـــ

" اوہ! تم ہے۔ مگر کینتز تو گھر چلی گئی۔"

جان نے گھڑی دیکھ کر کہا ـــ" ابھی تو ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ وہ تو بارہ بجے جاتی ہے۔"

بھاگرا بولا ـــ" آج کوئی گاہک نہیں آیا۔ اس لئے ذرا جلدی چلی گئی۔"

جان نے موٹر آگے بڑھائی۔ بولا ـــ" بیڈ لک صاحب بڑی اچھی چھوکری تھی اور رات کو بارہ بجے گھر جاتی ہے۔ کیونکہ شریف محلّے میں رہتی ہے۔ اسی لئے ساری رات دھندا نہیں کرتی۔ بارہ بجے گھر چلی جاتی ہے۔"

رمیش نے کہا ـــ

" مگر بارہ بجے جاتی ہے تو کیا شریف محلّے کے شریف لوگ اُس کی شرافت کو شبہ سے نہیں دیکھتے؟"

جان نے ہنس کر کہا ـــ" وہاں سے تو یہ کہہ کر آتی ہے کہ وہ کسی نائٹ اسکول میں پڑھنے جاتی ہے۔"

جان نے نندی سے پوچھا ـــ" اب بتاؤ کہاں چلیں؟"

نندی نے کہا۔" وہ سامنے کا جو کوٹھی خانہ ہے اُس میں۔

رمیش نے کہا۔" جہاں جاؤ کوٹھی خانہ سامنے ہو سکتا ہے۔"

ان نے کہا" آپ دیکھتے جایئے صاحب، یہاں جس جگہ آپ کا ٹھہرنے کا ارادہ ہو ٹھہر جائیں، ہم تو ٹیکسی چلانے والے ہیں بس۔"

یہ کوٹھی خانہ تیسری منزل پر تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے پروینہ نے رمیش سے کہا۔۔۔

"کیا بات ہے؟ تمہاری پسند آخر کیا چاہتی ہے؟ تم کہیں ٹھہرتے ہی نہیں ہو۔"

رمیش نے کہا" ٹھہرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خالی مطالعہ مقصود ہے۔"

انجم نے خوش ہو کے کہا۔۔" تو پہلے ہی کیوں نہیں بتایا مردود میں جب سے تجھے دل ہی دل میں گالی دے رہا تھا۔"

رمیش نے کہا۔" اور مطالعہ کے لئے اگر کہیں ٹھہرنا بھی پڑے تو ٹھہر جائیں گے۔"

" لعنت" پروینہ نے خفا ہو کر کہا۔

اُس کوٹھی خانے میں ایک عجیب بے پرواسی لڑکی نظر پڑی۔ وہ ایسے ان کی طرف دیکھتی تھی جیسے خلا میں دیکھ رہی ہو۔ جیسے اُس کے سامنے کوئی نہ ہو۔ نہ آدمی۔ نہ دیوار۔ نہ گناہ۔ نہ روپیہ۔ بس خلا ہی خلا رمیش کو یہ معاملہ کچھ دلچسپ سا معلوم ہوا۔ اُس نے یہاں ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا۔ پندرہ روپے طے ہوتے۔ اب انجم اور پروینہ کا کیا ہوگا؟

سانڈ نے کہا — "بیئر کی تین بوتلیں اور اُبلے ہوئے انڈوں کی تین پلیٹیں منگا لیجئے۔ تو میں دو تین لڑکیاں جو فی الحال بے کار ہیں، اِن حضرات کی ضیافت طبع کے لئے یہاں بھیج دیتا ہوں۔ یہ لوگ اُن سے گپ لڑائیں گے۔"

رمیش نے کہا "اگر تم دونوں ٹھہرنا چاہو تو ٹھہر جاؤ۔ میرے پاس پیسے ہیں۔"

"لاحول"، دونوں کے مُنہ سے معاً نکلا۔

بے پرواہ لڑکی کے ساتھ رمیش کو کیبن میں بند کر دیا گیا اور ایک گھنٹے کا ٹائم دیا گیا۔ کیبن میں ایک پلنگ تھا۔ پانی کا ایک جگ تھا۔ انڈوں کے چھلکے زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ دیوار پر دو ننگی عورتوں کی تصویریں تھیں۔ ایک مہاتما گاندھی کی تصویر تھی۔ سرسوتی دیوی کی تصویر تھی۔ ایک گلدستہ کی تصویر تھی۔ طاقچوں میں شراب کی خالی بوتلیں رکھی تھیں۔ بے پرواہ لڑکی نے کہا۔

"پہلے میں آپ کو ہار پہناؤں گی۔"

رمیش نے کہا۔ "کیوں؟"

وہ بولی — "میرا جی چاہتا ہے۔ اچھا بھی معلوم ہوتا ہے۔"

اُس نے آواز دی۔ ہار والا دو ہار لے کے آیا۔ پیسے لے گیا۔

پھر اُس نے کہا — "میرے خیال میں اب کچھ انڈے کھانے چاہئیں۔"

رمیش نے کہا — "اب تک تم کتنے انڈے کھا چکی ہو؟"

وہ بولی — "نہیں! اس میں مجھے کمیشن ملتا ہے۔"

رمیش نے کہا — "کمیشن ملتا ہے تو ٹھیک ہے۔ ایک پلیٹ منگا لو۔"

انڈوں کے بعد رمیش نے پوچھا — "اب کیا منگایا جائے ؟"

وہ بولی — "ایک بیئر کی بوتل۔"

"اس میں بھی کمیشن ملتا ہے ؟"

وہ بولی — "کوئی مجبوری نہیں ہے۔ اگر پسنجر خوشی سے منگائے گا تو مجھے بھی کمیشن ملے گا۔ نہیں تو نہیں ملے گا۔"

رمیش نے کہا — "تم کمیشن کی بہت شوقین معلوم ہوتی ہو۔"

وہ بولی — "اپنا اپنا شوق ہے اور پھر صاحب پندرہ روپوں میں مجھے کیا ملے گا۔ صرف دو روپے۔"

"اور باقی تیرہ روپے کہاں جائیں گے ؟"

"سات روپے سانڈ لیتا ہے۔ دو روپے حوالدار لیتا ہے۔ ایک روپیہ علاقہ کا غنڈہ لیتا ہے۔ دو روپے بلڈنگ کا سیٹھ لیتا ہے۔ ہمارے پاس تو پندرہ روپے میں سے دو روپے آتے ہیں۔ اس لئے بیئر منگاؤ ایک بوتل۔"

ایک بوتل بیئر آگئی۔

رمیش نے پوچھا — "یہ بلڈنگ کا سیٹھ تو کرایہ لیتا ہوگا۔ تمہارے حصے میں سے کیوں لیتا ہے ؟"

"بلڈنگ کے کرایہ کے علاوہ لڑکیوں سے کرایہ بھی تو لیتا ہے۔ صاحب!

سانڈے نے کہا ــــ "بیئر کی تین بوتلیں اور اُبلے ہوئے انڈوں کی تین پلیٹیں منگا لیجئے۔ تو میں دو تین لڑکیاں جو فی الحال بے کار ہیں، اِن حضرات کی ضیافت طبع کے لئے یہاں بھیج دیتا ہوں۔ یہ لوگ اُن سے گپ لڑائیں گے۔"

رمیش نے کہا "اگر تم دونوں ٹھہرنا چاہو تو ٹھہر جاؤ۔ میرے پاس پیسے ہیں۔"

"لاحول"، دونوں کے منہ سے معاً نکلا۔

بے پرواہ لڑکی کے ساتھ رمیش کو کیبن میں بند کر دیا گیا اور ایک گھنٹے کا ٹائم دیا گیا۔ کیبن میں ایک پلنگ تھا۔ پانی کا ایک جگ تھا۔ انڈوں کے چھلکے زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ دیوار پہ دو ننگی عورتوں کی تصویریں تھیں۔ ایک مہاتما گاندھی کی تصویر تھی۔ سرسوتی دیوی کی تصویر تھی۔ ایک گلدستہ کی تصویر تھی۔ طاقچوں میں شراب کی خالی بوتلیں رکھی تھیں۔ بے پرواہ لڑکی نے کہا۔

"پہلے میں آپ کو ہار پہناؤں گی۔"

رمیش نے کہا ــــ "کیوں؟"

وہ بولی ــــ "میرا جی چاہتا ہے۔ اچھا بھی معلوم ہوتا ہے۔"

اُس نے آواز دی۔ ہار والا دو ہار لے کے آیا۔ پیسے لے گیا۔

پھر اُس نے کہا ــــ "میرے خیال میں اب کچھ انڈے کھانے چاہئیں"

رمیش نے کہا ــــ "اب تک تم کتنے انڈے کھا چکی ہو؟"

وہ بولی ــــ "نہیں! اس میں مجھے کمیشن ملتا ہے۔"

رمیش نے کہا — "کمیشن ملتا ہے تو ٹھیک ہے۔ ایک پلیٹ منگا لو۔"

انڈوں کے بعد رمیش نے پوچھا — "اب کیا منگایا جائے ؟"

وہ بولی — "ایک بیئر کی بوتل۔"

"اس میں بھی کمیشن ملتا ہے ؟"

وہ بولی — "کوئی مجبوری نہیں ہے۔ اگر پسنجر خوشی سے منگائے گا تو مجھے بھی کمیشن ملے گا۔ نہیں تو نہیں ملے گا۔"

رمیش نے کہا — "تم کمیشن کی بہت شوقین معلوم ہوتی ہو۔"

وہ بولی — "اپنا اپنا شوق ہے اور پھر صاحب پندرہ روپوں میں مجھے کیا ملے گا۔ صرف دو روپے۔"

"اور باقی تیرہ روپے کہاں جائیں گے ؟"

"سات روپے سانڈ لیتا ہے۔ دو روپے حوالدار لیتا ہے۔ ایک روپیہ علاقہ کا غنڈہ لیتا ہے۔ دو روپے بلڈنگ کا سیٹھ لیتا ہے۔ ہمارے پاس تو پندرہ روپے میں سے دو روپے آتے ہیں۔ اس لئے بیئر منگاؤ ایک بوتل۔"

ایک بوتل بیئر آگئی۔

رمیش نے پوچھا — "یہ بلڈنگ کا سیٹھ تو کرایہ لیتا ہوگا۔ تمہارے حصے میں سے کیوں لیتا ہے ؟"

"بلڈنگ کے کرایہ کے علاوہ لڑکیوں سے کرایہ بھی تو لیتا ہے، صاحب!

ہم غریب لوگ پر کتنا ظلم کرتا ہے۔ ان پندرہ روپے میں سے دس ہمارے ہونے چاہئیں کم از کم۔ لیکن صرف دو ملتے ہیں اور سیٹھ کو دیکھو۔ اُس کے چار ایسے کوٹھی خانوں میں حصّہ ہے۔ بہت بڑا سیٹھ ہے اُس کی چار موٹر گاڑیاں ہیں ایک برف خانہ ہے۔ ابھی سُنتی ہوں۔ اُس نے ایک بہت بڑا مندر بنایا ہے۔"

رمیش نے انگلیوں پر گنتے ہوئے کہا——

"ساتھ روپے سانڈ کے۔ دو روپے حوالدار کے۔ ایک روپیہ غُنڈے کا۔ دو روپے بلڈنگ کے مالک کے۔ یہ تو بارہ روپے ہوئے اور دو روپے تمہارے چودہ روپے ہوئے۔ ایک روپیہ کا حساب بتاؤ؟"

وہ بولی——"وہ تمہارا ٹیکسی والا نہیں ہے گا۔ وہ جو تم کو یہاں لایا ہے اُس کو بھی کمیشن ملتا ہے۔ اُس کے کلینر کو بھی ملتا ہے۔ صاحب تم بہت اچھا لوگ ہے۔ ہم کو پانچ روپے بخشیش دو۔"

رمیش نے کہا——"پانچ روپے بخشیش کس لئے؟ جب پندرہ روپے دے دیئے۔"

وہ بولی——"اچھا تو جاؤ مت دو۔ ہم تم سے بات نہیں کرے گا۔"

رمیش نے کہا——"تم ایک شریف آدمی کو پریشان کرتی ہو۔"

وہ بولی——"شریف آدمی کو نہیں تو کیا بدمعاش آدمی کو پریشان کروں؟ بدمعاش آدمی تو اُلٹا آکے ہم کو پریشان کرتا ہے۔ شراب پی کر کے آتا ہے۔

کو کین کھاتا ہے۔ تم کو کیا معلوم بدمعاش ہم کو کیسا دِق کرتا ہے؟ لاؤ اب پانچ روپیہ میں تم کو خوش کر دوں گی۔

رمیش نے اُس کے قریب سے اُٹھتے ہوئے کہا — "اچھا تو میں چلتا ہُوں۔"

وہ بولی — "تم خفا ہو گئے صاحب!"

"نہیں"

"پھر کیا بات ہے؟"

رمیش نے کہا — "کچھ نہیں، میں ذرا ٹیڑھا آدمی ہُوں۔"

اُس نے دروازے پر رمیش کو پکڑ لیا۔ بولی — "میں تم کو شریف آدمی سمجھتی تھی۔ مگر تم بڑے وہ ہو۔ اچھا سنو! میں تم کو ہر طرح سے خوش کر دوں گی۔ مگر اُس کے لئے مجھ کو چپکے سے پندرہ روپے اور دے دو۔"

ٹیڑھا آدمی میں نے ایک سماجی نوعیت کا خیال کر کے کہا تھا۔ اُس نے کچھ اور سمجھا۔ اس سے میں اور بھی گھبرا گیا۔ دراصل میرا اور اُس کے درمیان کہیں کوئی نقطۂ اتصال نہ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب کھڑے ہو کر بھی ایک دوسرے سے بہت دُور تھے۔ جیسے رمیش ایک پہاڑ کی چوٹی پر تھا اور وہ دوسری چوٹی پر۔ اور دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر چلا چلا کر ایک دوسرے کو اپنا مفہوم سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

رمیش نے کہا —

نہیں نہیں جو تم سمجھ رہی ہو وہ میرا مطلب نہ تھا۔

"تو پھر کیا تھا؟"

"میرا مطلب یہ تھا میرا مطلب دراصل کچھ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اِس وقت میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے۔"

رمیش نے جلدی سے بہانہ کر کے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو اُس نے رمیش کی خوشامد کر کے اُسے روکنا چاہا۔ اب اُن کی آوازیں دوسرے کیبن میں پہنچ رہی تھیں۔ یک بیک دُوسرے کیبن میں سے ایک لڑکی نے چلّا کے کہا۔۔۔

"بھابھی کیا بات ہے؟"

بھابی نے یہاں سے جواب دیا۔۔۔"ارے میرے پسنجر کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔"

اور اس کے بعد بھابی ہنسنے لگی اور دُوسرے کیبن کی لڑکی بھی ہنسنے لگی۔ اور پھر تیسرے، چوتھے، پانچویں کیبن تک یہ بات پہنچی اور پھر تھوڑی دیر میں قہقہوں کا طوفان کوٹھی خانے میں گونجنے لگا۔ رمیش جلدی سے پسینہ پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔ اور انجم اور پروینہ کو لے کر پھر باہر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

جان نے خوش ہو کے پوچھا۔۔۔

"صاحب بیٹھا؟"

انجم نے کہا۔۔۔"نہیں صاحب! نہیں بیٹھا۔ صاحب کو لڑکی پسند نہیں آئی

نہ ہمیں پسند آئی؟"

جان نے ذرا پریشان ہو کر کہا — "پتہ نہیں آپ لوگوں کو کیسی لڑکی چاہیئے۔ اچھا اب میں ایک اور ترکیب کرتا ہوں۔ راستہ میں جو جہاں جہاں کوئی جگہ ملتی ہے۔ وہاں گاڑی روک کے آپ کو دکھاتا جاتا ہوں"

یہ کہہ کر وہ قریب کی ایک گلی میں مڑا۔ اُس کی گاڑی اندر داخل ہوتے ہی نکڑ پر چند لونڈیوں نے چلا کر کہا —

"ہے جان! کدھر جا رہا ہے؟"

جان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُنہیں ساتھ لے کے سامنے کی ایک بڑی بلڈنگ میں داخل ہوا۔ چار منزلہ بلڈنگ تھی۔ ہر منزل پر ایک مرکزی ہال تھا۔ اور اُس کے چاروں طرف کیبن تھے۔ سیڑھیوں پر دو تین مشتبہ قسم کے لوگ چُپ چاپ کھڑے تھے۔ اس بلڈنگ کا سانڈ اُتر پردیش کا بھیّا تھا۔ اُس نے ایک لمبی چوٹی رکھی ہوئی تھی۔ اُس کا سر گھٹا ہوا تھا اور اُس کا جنیئو اُس کی بنڈی سے باہر نکلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اُس کی صورت رمیش کو جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ رمیش نے اُس سے کہا —

"میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے؟"

وہ بولا — "صاحب! میں دِلّی میں آپ کے گھر دودھ دیتا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"دونوں بھینسیں مرگئیں۔ پھر بہت کچھ ہوا۔ پوچھ کر کیا کیجئے گا۔ آپ اپنا کام کیجئے۔"
رلیش نے کہا ــــ "ارے رام بھروسے! اب تو تم مزے میں ہو گئے؟"

رام بھروسے بولا ــــ "صاحب! جس دن سے میں نے اپنی بیوی سے پیشہ کرانا شروع کیا تھا۔ اُس دن سے آج کے دن تک بڑے مزے میں ہوں۔ اس بلڈنگ میں اب میرے پاس ڈیڑھ سو عورتیں ہیں۔ میں اکیلا سانڈ ہوں۔ گاؤں میں پکّا گھر بھی بنا لیا ہے۔ بنک میں روپیہ بھی ہے۔ آئیے آپ کو مال دکھاؤں۔ کشمیر سے لے کر مدراس تک کا مال میرے پاس ہے۔"

"اور تمہاری بیوی۔"

"نہیں نہیں صاحب!" رام بھروسے زور سے بولا ــــ "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ وہ تو میں نے پرائشچت کرا لیا تھا۔ اب بھی روزدان پُن کرتا ہوں۔ صبح کو پوجا کرتا ہوں۔ اب تو میری بیوی کے تین بچے ہیں۔ آئیے۔ اُوپر کے ہال میں چلئے۔ میں سب کو ابھی بلوائے لیتا ہوں۔"

ڈیڑھ سو میں سے ایک سو سولہ لڑکیاں آئیں۔ ایک سو سولہ لڑکیوں کا قطار باندھ کے چلنا بہت اچھا معلوم ہوا۔ یہاں ہندو مسلم اتحاد بھی تھا۔ مختلف قوموں کی باہمی رواداری بھی تھی۔ مساوات اور اخوت بھی۔ پھر یہ سب کی سب عورتیں تھیں۔ کم از کم ان کے چہرے عورتوں کے سے تھے۔ یہ واقعی عورتیں ہیں۔ یہ مصری میاں نہیں ہو سکتیں۔ یہ لاشیں بھی نہیں ہو سکتیں۔ یہ بھیڑیں

بھی نہیں ہو سکتیں۔ کس قدر خموشی سے، سکون سے، بغیر کسی مسکراہٹ کے یہ عورتیں اُن کے سامنے سے گزر رہی جا رہی تھیں۔ پتہ نہیں اس ہال کے آگے کیا ہے! کیا وہاں کوئی بوچڑ خانہ ہے یا مندر ہے، یا بنک ہے یا اُدھر کوئی گہری کھائی ہے۔ مگر گہری کھائی نہیں ہو سکتی۔ ورنہ ان عورتوں میں سے کوئی چیختی، چلاّتی، شور کرتی، واویلا کرتی، چُپ چاپ چلتی ہوئی عورتو! تم اتنی چپ کیوں ہو؟ ایک بات پوچھوں——؟ تمہارے دل کے اندر اب بھی کوئی ماں موجود ہے؟ کوئی بہن موجود ہے؟ کوئی محبوب موجود ہے؟ کیا رات کو تم کبھی کوئی سپنا دیکھتی ہو؟ بولو! کس نے تمہارے ہونٹ سی دیئے۔ کس نے تمہاری آنکھوں میں شگاف کر دیا؟ کس نے تمہارے جسموں کا گریز چھین لیا ہے؟ تم اپنی رعنائی کس خبیث کے جنیؤ کے پاس چھوڑ آئی ہو؟ کوئی نہیں بولتی۔ کوئی نہیں بولتی۔ قافلہ چپ چاپ گزر رہا ہے۔ پرویز کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ انجم کا چہرہ فق۔ رمیش آہستہ سے کرسی سے اُٹھا۔ پرویز اور انجم اُس کے ساتھ ہو لئے۔ رام بھروسے نے رمیش کے کان میں کہا——

"آپ اپنے ان دوستوں کو چھوڑ دیجئے۔ رات بھر میرے ساتھ رہیئے۔ میں آپ سے ایک پیسہ نہ لوں گا۔ آپ کلکتے آئے ہیں۔ ہمارے مہمان ہیں۔ آپ کی خاطر کرنا ہمارا فرض ہے۔"

وہ چُپ چاپ بغیر کچھ کہے سیڑھیوں سے اُتر گئے۔ سیڑھیوں سے نیچے

اُترتے ہوئے رمیش نے دیکھا کہ جان ہاتھ میں نوٹ بُک لیئے کچھ لکھ رہا ہے۔
وہ چُپ چاپ نیچے اُترنہ کہ اُس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انجم نے کہا۔۔۔۔

"بس اب واپس گھر چلو۔"

رمیش نے کہا۔۔۔ "نہیں ابھی اور دیکھیں گے۔"

پرویز بولا۔۔۔ "خدا کے لیئے بس کرو۔ تم نے میرا سارا مزہ کرکرا کر دیا ہے۔"

میش نے پوچھا۔۔۔ "میں نے بھلا کیا کیا ہے؟"

پرویز بولا۔۔۔ "اس سے پہلے میں دو سال ہوئے اپنے دو ایک دوستوں کے ساتھ گانا سُننے اِدھر آیا تھا۔ میرے ذہن میں طوائف کا تصور یوں آتا تھا۔ اُس کا سجا ہوا کوٹھا۔ چھت سے فانوس لٹکتا ہوا، صاف شفاف طشتری میں پان سجے ہوئے اور ایک دلنواز تبسّم، ایک خوش گلو مطربہ کی ٹھمری، سانس میں الائچی کی مہک ۔۔۔ تم نے سب ستیا ناس کر دیا۔ بس اب سیدھے گھر چلو۔"

رمیش نے کہا۔۔۔ "نہیں ابھی اور دیکھیں گے۔"

جان نے کہا۔

"صاحب! اب ڈیڑھ بجا ہے۔ ابھی تک آپ کو کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔ میں سوچتا ہوں۔ آپ شاید کسی ناچنے والی کو پسند کریں۔ ایک کام کرتا ہوں۔ سیالدہ اسٹیشن پہ چل کے بندو کو اپنے ساتھ لے آتا ہوں۔ بندو ایک ڈانس ماسٹر

کو جانتا ہے۔ وہ ڈانس ماسٹر، ہمارا کام کر دے گا۔"

"ڈانس ماسٹر!"

"ہاں صاحب! اُس کے پاس بڑی اچھی اچھی لڑکیاں ہیں۔"

وہ لوگ سیالدہ اسٹیشن گئے۔ سیالدہ اسٹیشن سے بندو کو لیا۔ بندو انہیں تنگ و تاریک گلیوں سے گھماتا ہوا ونود ڈانس ماسٹر کے گھر لے گیا۔ انہوں نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر لی۔ اب گلی میں اندھیرا تھا۔ صرف ایک جگہ بتی جل رہی تھی۔ سب دروازے، کھڑکیاں بند تھیں۔ بندو بہت دیر تک آوازیں دیتا رہا۔

"اے ونود بابو! اے ونود بابو!"

بہت دیر کے بعد ونود بابو اُٹھے۔ پہلے تو گالیاں دیتے رہے "کون سُور کا بچہ اس وقت پریشان کر رہا ہے۔" پھر جب انہوں نے بندو کو پہچانا تو نیچے اُتر آئے اور اُس سے کچھ کھسر پھسر کرتے رہے۔ آخر میں بندو اور ونود دونوں اُن کی گاڑی کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ ونود بابو کا سر گھٹا ہوا تھا۔ ماتھے پر چندن لگا ہوا تھا۔ وہ ایک گیروے رنگ کی دھوتی پہنے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر بولے —

"شما کیجئے بابو! ہم نے سنیاس لے لیا ہے۔ اب ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔"

"سنیاس؟" رمیش نے چونک کر پوچھا۔

ونود بابو بولے "جی ٹھیک کل بیساکھی کے دن میں اس مہینے میں سات دن

کے لئے سنیاس لے لیتا ہوں۔ اور سادھو ہو جاتا ہوں۔ ان سات دنوں میں کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا۔ ہاں! اگر آپ ان سات دنوں کے بعد مجھ سے ملیں تو ایک سے ایک بڑھیا ناچنے والی جو فلم میں بھی کام کرتی ہوگی، اس سے آپ کی پہچان کرادوں گا۔"

"مگر میں تو آج کلکتے سے جا رہا ہوں۔ کیا کسی طرح آپ آج کی رات اپنا سنیاس نہیں توڑ سکتے؟" رمیش بولا۔

ونود بابو ہاتھ جوڑ کے بولے ——

"دیوتا ناراض ہوں گے صاحب۔ مجبوری ہے۔ آپ سات دن کے بعد ملئے نا۔"

"اچھا تو نمستے سنیاسی جی۔"

"نمستے۔"

"گاڑی موڑ لو جان بابا۔" بندو نے کہا۔ "میں ان کو اب بنگالیوں کی پارٹی میں لے چلتا ہوں۔ ٹھیٹھ بنگالی لوگ ہوں گے۔ بالکل وہی انداز وہی طریقے، وہی مزاج، وہی لباس، وہی کلچر۔"

"کلچر کی بات کرتے ہو۔" انجم زور زور سے ہنسنے لگا —— "بندو میاں! خدا کے لئے یہاں تو کلچر کی بات مت کرو۔"

بندو میاں خفا ہو گئے۔ زور سے بولے ——

"نہیں صاحب! میں بالکل ٹھیک کہتا ہوں۔ بالکل وہی کلچر، بالکل وہی کلچر۔ میں سچ کہتا ہوں۔ آپ کو بالکل ایسا معلوم ہوگا۔ جیسے کسی شریف آدمی کے گھر میں آگئے۔ اُن میں سے کئی ایک کو ٹیگور اور نذرالاسلام کے گیت بھی یاد ہیں چلئے آپ کو سُنواتے ہیں۔"

بنگلہ باڑی میں تین بلڈنگیں دیکھیں۔ پھر ایک بلڈنگ اور کسی جگہ دیکھی۔ اب نام بنام پتے کچھ یاد نہیں رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے باڑی ساکن ہے۔ صرف سڑک چلتی جا رہی ہے اور سانپ کی طرح لڑکیوں کو قطار اندر قطار اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی ہے۔ جیسے گاڑی بھی ساکن ہے اور سڑک بھی ساکن ہے۔ صرف بلڈنگیں چلتی ہوئی موٹر کے شیشے کے سامنے متحرک تصویروں کی طرح گزرتی جا رہی ہیں، ہر بلڈنگ کے بیچ میں موٹا سیٹھ بیٹھا ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر بلڈنگ کو اُن کے سامنے لاتا ہے اور جب وہ اُسے ناپسند کر دیتے ہیں تو دوسری بلڈنگ سرکتی ہوئی اُن کے سامنے آجاتی ہے۔ سیٹھ کا چہرہ تاریکی میں ہے۔ ہاں بلڈنگ کی ہر کھڑکی روشن ہے اور سرکتا ہوا ہر کھلونا اُن کی نظروں کے سامنے گھومتا جاتا ہے۔ لوگ روشنی کو دیکھتے ہیں۔ روشنی کے پیچھے جو تاریکی ہے اُسے نہیں دیکھتے بلڈنگ کو دیکھتے ہیں۔ بلڈنگ کے پیچھے جو ہاتھ ہے، اُسے نہیں دیکھتے۔

کتنی ہی سڑکیں گزر گئیں۔ کتنی ہی گلیاں گزر گئیں کتنے ہی قافلے گزر گئے۔ بھیانک راستے اپنے سارے لاشے اُگل دیتے تھے۔ بلڈنگیں چڑھتے چڑھتے،

پھر نیچے اُترتے اُترتے جسم پسینے سے شرابور ہو گئے۔ ہر بلڈنگ کے باہر انجم اور پرویز رمیش کی منّت سماجت کرتے ـــــ

"خدا کے لئے اب تو بس کرو۔ اب یہ مہیب منظر ہم سے نہیں دیکھا جاتا"

لیکن رمیش مسکرا کر بلڈنگ کے اندر چلا جاتا۔ پھر انہیں بھی اس کے پیچھے پیچھے جانا پڑتا۔ کیونکہ رمیش اُن کا مہمان تھا اور وہ اُس کی حفاظت کرنے پر مجبور تھے۔ رمیش کی طرف داری ڈرائیور بھی کر رہا تھا۔ اُس وقت وہ ایک عجیب جوش میں تھا۔ لیکن اُس کا جذبہ اُن سے بالکل مختلف تھا وہ اس دُھن میں تھا کہ آج انہیں کہیں نہ کہیں بٹھا دے گا۔ انہیں اتنی لڑکیاں، اتنی لڑکیاں دکھاؤں گا کہ آخر کہیں نہ کہیں یہ بیٹھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اسی طرح گھومتے گھومتے جب رات کے چار بج گئے تو ایک حادثہ ہو گیا۔ موٹر میں پٹرول ختم ہو گیا اب وہ جس بلڈنگ سے نکل کر آ رہے تھے، اُس میں یہودنیں، پارسنیں اور مغربی عورتیں رہتی تھیں۔ درجہ اونچا تھا لیکن ریل گاڑی وہی تھی۔ سفر بھی وہی تھا۔ منزل بھی وہی تھی۔

بلڈنگ سے باہر نکل کر وہ لوگ موٹر میں بیٹھ گئے۔ جان نے موٹر اسٹارٹ کی۔ اسٹارٹ ہو کر موٹر بند ہو گئی۔ پھر معلوم ہوا پٹرول نہیں ہے۔ بلڈنگ کے نیچے بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ لیکن سب ٹیکسیاں تھیں جتنے اوپر کے کمرے بُک تھے اتنی ہی نیچے کی گاڑیاں بُک تھیں۔ ڈرائیور سو رہے تھے۔ جان نے بڑی

مشکل سے ایک ڈرائیور کو جگا کہ اُس سے پٹرول حاصل کیا اور چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ کہ انجم اور پرویز گاڑی سے نکل آئے۔ بولے ــــ

"رمیش تم جاؤ۔ اب، ہم آگے نہیں جائیں گے۔"

"تو کہاں جاؤ گے رات کے چار بجے۔"

انجم نے کہا ــ "کہیں نہیں جائیں گے۔ سامنے پارک میں بنچ پہ بیٹھ جائیں گے مگر اب کہیں اور کسی جگہ نہیں جائیں گے۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔"

رمیش نے کہا ــ "مگر اب تک لڑکی دیکھی نہیں ؟"

جان کو اس پر غصّہ آگیا۔ اتنی دیر سے وہ صبر کئے بیٹھا تھا۔ اب ایک دم رمیش پر برس پڑا۔

"صاحب آپ کیا بولتے ہیں ؟ آپ نے لڑکی نہیں دیکھی ؟ ارے صاحب میں نے آپ جیسا صاحب نہیں دیکھا۔ اس وقت تک رات کے دس بجے سے لے کر چار بجے تک آپ کو ایک ہزار چار سو بہتّر لڑکیاں دکھا چکا ہوں۔"

"ایک ہزار چار سو بہتّر لڑکیاں ؟ باپ رے باپ ! سچ کہتے ہو ؟"

جان نے اپنی نوٹ بک رمیش کے ہاتھ میں دے دی۔ کہا "دیکھ لیجیے جس بھی بلڈنگ میں ہم گئے، وہاں جتنی لڑکیاں تھیں، سب کو گن کر اُن کا حساب میں نے یہاں رکھا ہے ــ" وہ اپنی نوٹ بک کو زور سے تھپتھپاتے ہوئے بولا ــ ایک ہزار چار سو بہتّر لڑکیاں اور آپ کہتے ہیں، میں نے آپ کو لڑکی نہیں دکھائی۔"

انجم نے آہستہ سے کہا۔۔۔

" دوست! تم ہمیں قبرستانوں میں لئے پھرتے رہے ہو۔ اور لڑکی قبرستان میں نہیں ملتی۔"

جان بے چارہ کچھ نہ سمجھا۔ چُپ چاپ انجم کا منہ دیکھنے لگا۔ پرویز نے جان سے کہا۔۔۔

" جان صاحب! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ قصور ہمارا ہے۔ دراصل ہم کسی اور مطلب کے لئے آتے تھے اور وہ مطلب پورا ہو گیا ہے۔ اب تم اس گاڑی میں آرام سے بیٹھو یا سو جاؤ۔ ہم لوگ اب صبح یہاں سے جائیں گے۔ اس پارک میں بیٹھتے ہیں کسی نے پوچھا تو کہہ دیں گے۔ ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے سمجھے۔"

" بہت اچھا صاحب "

انجم نے کہا۔۔۔ " سگریٹ ختم ہو گئے اور اب اس وقت سگریٹ کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کہیں سے مل جائیں تو مزا آجائے۔"

پرویز نے کہا۔۔۔ " اور اس وقت میں اندر سے بالکل خالی خالی محسوس کر رہا ہوں۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔"

اتفاق سے پارک کے جنگلے کے آہنی دروازے کے قریب ایک درخت کے نیچے ایک چنے والا سویا ہوا مل گیا۔ انہوں نے اُسے جگا کر اُس سے چنے لئے۔ چند

بیڑیاں بھی مانگ لیں اور پھر ٹہلتے ٹہلتے پارک کے بنچ پر آ بیٹھے۔ پارک میں دُھندلا دُھندلا اندھیرا تھا۔ آسمان پہ بھی ایسا ہی اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں دُھندلے تارے سوئے ہوئے معصوم بچوں کے چہروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ فضا میں ہلکی ہلکی خُنکی تھی۔ چاروں طرح سنّاٹا تھا صرف سامنے کی بلڈنگ کے روشن دریچوں میں سے کبھی کبھی شرابی قہقہے چھن کر باہر آ جاتے تھے۔

بنچ پر بیٹھ کر وہ لوگ بہت دیر تک چپ رہے۔ بیڑی کا دُھواں بہت خوشگوار تھا۔ اس میں پتّے کی مہک اور اُس کا کڑوا سوندھا پن بہت لُطف دے رہا تھا۔

پروین نے کہا— "رمیش! تم نے بہت بُرا کیا۔ میرے ذہن سے مُنّی جان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔"

انجم نے کہا— "رمیش نے بہت اچھا کیا۔ آج کی رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ ایک رات، ایک بوتل، ایک عورت۔ سوال اتنا سیدھا نہیں ہے۔ میں نے سوال کو اُس کی پوری ہیبت ناکی کے ساتھ یوں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سوچا ضرور تھا۔ لیکن سوچنے اور دیکھنے میں بہت فرق ہے۔"

"سوال تو ایک لڑکی کا ہے۔" رمیش نے کہا۔

انجم نے کہا— "ایک لڑکی میری بہن ہے شکیلہ۔ ساتویں میں پڑھتی ہے۔ اُس کی ماں مر چکی ہے۔ باپ مر چکا ہے۔ صرف میں ہی ہوں۔ اور میری آمدنی کیا ہے؟

وہ بھی تم جانتے ہو۔ شکیلہ کو میں نے گودیوں میں کھلایا ہے۔ اگر کل کو مجھے کچھ ہو جائے تو شکیلہ کا کیا ہوگا؟ اور ہمارے صوبے کے بڑے وزیر ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے اُس کی کیا مدد کریں گے؟"

"ہوں!" پرویش نے کہا —— "پھر یہ سوچو شکیلہ بچی گڑیوں سے کھیلتی ہے گُڈّوں کا بیاہ رچاتی ہے۔ اُس کا ایک بھائی ہے۔ اُس کی اُنگلی پکڑ کے چلتی ہے اسکول جاتی ہے۔ اُس کی سہیلیاں ہوتی ہیں۔ اُس کی کتابیں ہوتی ہیں۔ دُوسروں کی زندگی کو بلند کرنے کا پاک جذبہ۔ ماں کی محبوب شفقت، نگاہ کی شفاف نرمی سوچو تو کتنی خوبصورتیوں کا خون ہوتا ہے ایک ساتھ۔ اور یہی ایک رات گزری ہے ادھیڑ ایک ڈرائیور ہے اور کلکتے کے صرف ایک کوٹے سے واقف ہے۔

انجم نے پوچھا —— "سوال یہ ہے کہ شکیلہ ایک لڑکی ہے یا جنس خرید ہے۔ وہ ماں ہے کہ اندھا کنواں ہے؟ وہ میری بہن ہے کہ ہاروں میں لپٹی ہوتی نجاست ہے؟"

رمیش نے آہستہ سے کہا —— "سوال ایک شکیلہ یا شانتی کا نہیں ہے۔ ہم نے ابھی سامنے کی بلڈنگ میں مغربی عورتیں بھی دیکھی ہیں۔ عورت کے خلاف یہ سازش کلکتے سے لندن تک پھیلی ہوتی ہے۔ سوال ایک لڑکی کا نہیں ہے۔ سوال ایک پورے نظام زندگی کے خاتمے کا ہے جس میں دس بجے تک تو پنڈت نہرو کی تقریر ہوتی ہے اور دس بجے بعد ایک ہزار چار سو بہتر طوائفیں ہوتی ہیں۔"

پرویز نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوتے کہا ——

"تارے ماند ہوتے جا رہے ہیں۔ اُفق پر بادل آ رہے ہیں۔ کل بیساکھی کا دن ہے۔ شاید کوئی طوفان آنے والا ہے۔"

لاہور کی گلیاں

لاہور میں لوہاری گیٹ کے اندر ایک چوک ہے۔ چوک متی۔ اس چوک متی کے اندر، ہماری گلی تھی کوچہ پیر شیرازی۔ یہ ایک تنگ و تاریک گلی تھی۔ جس کے تین طرف مکان تھے۔ باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ جو چوک متی کو جاتا تھا اس گلی میں ہم اپنے بڑھے تایا جی کے گھر میں رہتے تھے۔ یہ ایک اندھیرے کمروں والا دو منزلہ مکان تھا۔ جس کی صرف چھت پہ دھوپ آتی تھی۔ سیدھے نچلی منزل میں تایا جی کا مطب تھا۔ جہاں وہ ہر روز صبح کو گلی کے ننگ دھڑنگ بچوں میں سونف کی میٹھی گولیاں اور چورن کی گولیاں بانٹتے تھے۔ صبح ہوتے ہی ننگ دھڑنگ بچے ننگی ٹانگوں اور ناف سے اونچی قمیض پہنے ہوئے میلی آنکھوں اور بہتی ناکوں کے ساتھ مطب میں داخل ہوتے۔ بچیاں عام طور پہ چورن کی گولیاں مانگتی تھی اور بچے میٹھی گولیوں کے عاشق تھے۔

حکیم صاحب صرف ہمارے ہی تایا نہیں تھے۔ وہ ساری گلی کے تایا تھے اور سب کے خاندانی حکیم تھے۔ چھیانوے برس کی عمر تھی۔ مگر رنگ اس قدر سرخ و

سپید، آواز ایسی ٹھاٹ دار، صحت اس قدر عمدہ کہ حیرت ہوتی تھی۔ کہ اس تنگ و تاریک گلی میں جہاں صاف آب و ہوا کا گزر نہیں ہوتا۔ جس کے مرکز میں ایک کھلی موری بہتی ہے۔ جہاں فرش نہیں شاور نہیں ٹائلیں نہیں، باغیچہ نہیں، پھول نہیں، درخت نہیں، اُفق تا اُفق، جدھر نظر دوڑاؤ، تنگ و تاریک مکان نظر آتے ہیں۔ جن پر ایک چھوٹا سا مستطیل نما آسمان ٹین کے ٹکڑے کی طرح لٹکا ہوا ہے۔ اس گندے ماحول میں ایسی عمدہ صحت کہاں سے آئی ہے؟

ہمارے گھر کے سامنے دتے موچی کا ایک منزلہ مکان تھا۔ دِتا موچی جُوتے کیسے بناتا ہے؟ اس کا تو مجھے علم نہیں ہے۔ لیکن اُس کی بیوی بے حد خوبصورت تھی چونکہ دِتے کا مکان ایک منزلہ تھا اور ہمارا دو منزلہ۔ اس لئے دِتے کی بیوی کو دیکھنے کے کئی مواقع مجھے دن میں میسّر آجاتے تھے اور میں چھپ چھپ کر اسے دیکھتا تھا اور اگر کبھی دتے موچی کی بیوی کہتی ــــ "ماں جی! تمہارا لڑکا بڑا شرمیلا ہے۔" اُسے کیا دنیا میں کسی کو بھی آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ کیسی الھڑ، انجانی، انوکھی محبت ایک ننھی سی کونپل کی طرح میرے دل میں پھُوٹی اور کہیں کوئی سہارا نہ پاکر خود مجھ سے بھی کوئی سہارا نہ پاکر دن رات اپنی ننھی ننھی آرزوؤں کی پتیوں میں لرزتی رہی۔ یہ محبت جس نے کسی سے کچھ کہا نہیں کسی سے کچھ مانگا نہیں کسی کو درد نہیں دیا۔ کسی کی بدنامی نہیں مول لی اپنے آپ میں گمن، چند دزدیدہ نگاہوں پر جینے والی معصوم محبت۔ وہ جذبہ آج کدھر گیا۔ جو کسی سے کچھ نہ مانگے۔ اُسے بہت ڈھونڈتا

ہوں۔ کسی شہر میں وہ جذبہ نہ ملا۔ کسی گاڑی میں وہ جذبہ نہ ملا۔ کسی لق و دق صحرا میں وہ جذبہ نہ ملا سیے کنار سمندر کے کنارے، جہاں ناریل کے مورپنکھ فضا میں جھولتے ہیں اور مچھیرے جال پھینک کر مچھلیوں کو پھانستے ہیں، وہاں بھی مجھے وہ معصوم جذبہ نہ ملا۔ جو آج ایک تنگ سی گلی میں دفن ہے۔

دِتّے موچی کی بغل میں ایشر داس براہمن کا مکان تھا۔ ایشر داس کا باپ مر چکا تھا۔ اُس کی ماں بیوہ تھی۔ ایشر داس کے تین چھوٹے چھوٹے بھائی تھے اور خود ایشر داس آوارہ مزاج نوجوان تھا۔ اُس کے بھائی گھروں میں برتن مانجتے۔ اُس کی ماں ہمارے یہاں نوکرانی تھی۔ مگر ایشر داس ہیلر دوست تھا۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اُسے کوئی کام آتا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں اور چھوٹے چھوٹے بھائیوں کی کمائی پر زندہ تھا اور وہ لوگ بھی اُس کے لئے کما کر اُسے کھلا پلا کر اچھے کپڑے پہنا کر بہت خوش ہوتے تھے۔

ایشر داس یوں دیکھنے میں بے حد بدصورت تھا۔ مگر اونچا لمبا تگڑا جوان تھا۔ بہت صاف ستھرے کپڑے پہنتا تھا۔ جو قیمتی تو نہ ہوتے تھے مگر بے حد سپید ہوتے تھے ایشر داس کی دوستی لاہور کی بہت سی گلیوں سے تھی۔ اُن کے مختلف ماحول سے تھے، اُن میں رہنے والے بہت سے ایسے لوگ تھے، جو اُس کی طرح بے کار لیکن صاف ستھرے چمکتے ہوئے پھرتے تھے اور کبھی کبھی دوکان پر بیٹھ کر تاش کھیلتے۔ کبھی چوک کے نکڑ پر پان کھاتے اور خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے گھومتے تھے اور آوارہ

اور بدمعاش کہلاتے تھے۔ کوئی ایشر داس کی ماں سے پوچھے کہ اُس کا بڑا لڑکا اُس کے لئے مر گیا تھا۔ اُسے صاف ستھرے کپڑوں میں دیکھ کر جانے وہ عورت اپنے کون سے ارمان پورے کر لیتی تھی۔ جانے کونسے رنگ محل آباد کر لیتی تھی۔ جانے تصوّر کی کس دنیا میں پہنچ جاتی تھی؟ سب لوگ اُسے ڈانٹتے تھے کہ وہ اپنے لڑکے سے کچھ نہیں کہتی ہے اور لاڈ پیار سے اُس کی زندگی برباد کر رہی ہے۔ پھر بھی ماں نے اپنے اوباش بیٹے سے کچھ نہیں کہا۔

ایک دن اُس کے گھر میں ایشر داس ایک عورت اور تین بچّوں کو لے کر داخل ہوا۔ اور اُس دن سے گھر میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہ عورت ایشر داس کے مرحوم چچا کی بیوی تھی۔ جس نے اپنی ذات سے باہر شادی کی تھی۔ اس لئے ایشر داس کی ماں اُسے منہ نہ لگاتی تھی۔ بے چاری بیوہ کوچہ چرٹی ماراں میں پڑی فاقوں پر گذر کر رہی تھی۔ کہ ایشر داس کو اُس پر رحم آ گیا اور وہ اُسے کوچہ چرٹی ماراں سے اُٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ اس بُڑھی ماں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ کس کس طرح وہ غریب دن رات محنت مزدوری کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتی تھی کہ گھر میں چار اور مہمانوں کا اضافہ ہو گیا۔ اُسی دن پہلی بار ماں کے صبر کے بندھ ٹوٹ گئے۔ اور اُس نے جی کھول کر اپنے آوارہ بیٹے کو سنائیں۔

ایشر داس اپنے مرحوم چچا کی بیوی اور بچوں کو واپس کوچہ چرٹی ماراں میں چھوڑ آیا۔ لیکن اس کے بعد اُس نے واپس گھر آنا بند کر دیا۔

ایک دن میں نے دیکھا، وہ لوہاری گیٹ کی پھل والی دوکانوں کے عقب میونسپل باغ میں مجمع لگائے آنکھوں کا سُرمہ بیچ رہا ہے۔ کیسی فصاحت تھی اُس کی زبان میں۔ کیا پُرشکوہ روانی تھی اُس کے بیان میں۔ کس چٹخارے سے وہ سُرمہ اکسیر چشم بیچ رہا تھا۔ گویا وہ سُرمہ نہیں، دہی بڑے کی چاٹ بیچ رہا ہو۔ یہ آگ کہاں سے اُس کے دل میں آئی تھی؟

جب مجمع چھٹ گیا اور، ہم دونوں دوست گلے ملے تو اُس نے مجھے بتایا کہ اُس نے اب تہیّہ کر لیا ہے کہ وہ شب و روز مجمع لگا کے سُرمہ اکسیر چشم بیچے گا۔ سانڈے کا تیل۔ فاسفورس کا میل بیچے گا۔ مگر ہر روز اپنی چچی اور اُس کے ننّھے ننّھے بچوں کے لئے نان و نفقہ کا بندوبست کرے گا۔

جب میں نے پوچھا کہ تم میں یہ تبدیلی کیسے آگئی؟

وہ تھتھے پھُلا کر بولا ـــــ "تم نہیں جانتے۔ تم نہیں جانتے۔ میری چچی پیشہ کرتے جا رہی تھی فاقوں سے مجبور ہو کر۔ پھر میں کیا کرتا؟ بولو! بولو! میں کیا کرتا؟"

میں نے کہا ـــــ "اور تم اپنے گھر میں کچھ نہیں دو گے؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ بولا۔ "میری ماں اپنا گھر سنبھالتی ہے۔ میں دوسرا گھر سنبھالوں گا۔ نہیں تو میری چچی پیشہ کرے گی اور خاندان کا نام۔۔۔"

جانے آج وہ خاندان کا نام رکھنے والا۔۔۔ کہ مجمع لگانے والا، سفید شلوار اور لکیر دار بوسکی کی قمیض پہننے والا ایشر داس کہاں ہے؟

دِتّے موچی کا بڑا بھائی جیبب گلی کے سرے پہ لکڑیوں کی دوکان کرتا تھا۔ یوں تو بیچتا چوب خشک تھا مگر اُس کا دل بڑا سرسبز تھا۔ پنجابی کے ہزاروں شعر اُسے یاد تھے۔ وہ اپنی آنکھوں میں سُرمہ لگاتا تھا اور مغربی طرز کے بال سر پہ رکھتا تھا جس سے پُرانے بزرگ ہمیشہ اُس سے خفا رہتے تھے وہ کسرت بھی کرتا تھا اور اپنے محلے کا سب سے خوبصورت جوان سمجھا جاتا تھا۔

جیبب محلے کی ایک ہندو لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ محبت بھی اُس نے وہاں لگائی تھی، جہاں اُس کی رسائی نہ تھی۔

موہنا رائے بہادر گینڈا رام کی لڑکی تھی۔ جن کا مکان گلی میں سب سے اُونچا سب سے خوبصورت اور سب سے بڑا تھا۔ بڑے بڑے آہنی پھاٹکوں والا دروازہ جیبب کے لکڑی کے ٹال کے عین سامنے کھلتا اور وہ عالمِ شباب میں مست و مخمور موہنا کو کالج آتے جاتے دیکھتا۔ موہنا کوئی اتنی خوبصورت لڑکی نہ تھی۔ کم از کم مجھے اتنی اچھی کبھی نہ لگی۔ ہاں! بڑے گھر کی لڑکی ضرور تھی اور بڑی شوخ، چنچل اور مغرور تھی۔ ایک بات البتہ مجھے اس کی پسند تھی۔ وہ ناچتی بہت اچھا تھی۔ جانے وہ کتھک ناچ تھا کہ منی پوری تھا۔ مگر کیا ناچ تھا۔ جب وہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر ناچتی تھی۔ تو جیبا کبھی کبھی میرے مکان کی چھت پر آکر اُس کا ناچ دیکھا کرتا تھا اور آہیں بھرا کرتا تھا اور ایسے ایسے شعر پڑھا کرتا تھا کہ آگ میں جلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور خون میں نہائے ہوئے معلوم ہوتے

تھے۔ اُن شعروں سے دھواں سا اُٹھتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اُن سے جلتے ہوئے گوشت کی بُو آتی تھی۔ اس کے بعد زندگی میں بہت سے مشاعروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مگر جیب ایسا پڑھنے والا آج تک کہیں نہ ملا۔

کیسی بے بسی اور مجبوری تھی اُس کی۔ جب کبھی مغرور موہنا نظریں بچا کر اُس کی طرف دیکھ لیتی تو جیب پر کئی کئی دن تک اُس کا نشہ رہتا۔ اگر کسی دن وہ موہنا کا ناچ دیکھ لیتا تو گھنٹوں اپنے آپ میں کھویا رہتا۔ اُس کے رشتہ دار اُسے بہت سمجھاتے بُجھاتے۔ مگر جیب پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ آخر پریشان ہو کر جیب کے گھر والوں نے اُس کی شادی کر دی۔ مجھے وہ روز یاد ہے، جیب دولہا بنا ہوا تھا۔ بارات سجی کھڑی تھی نُکڑ پہ۔ بینڈ زور زور سے چلّا رہا تھا۔ گلی کی عورتیں نئے کپڑے اور زیورات پہنے مسرت سے لبریز اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہنستی گاتی گھوم رہی تھیں۔

آج دِتّے کی بیوی مجھے کتنی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ عورتوں نے گاتے ہوئے جیب کو گھر سے وِداع کیا اور جیب پھولوں کے ہار اور سہرے پہنے گلی میں چلتا گیا۔ چلتے چلتے جب وہ اپنی دوکان کے سامنے رائے بہادر کے آہنی پھاٹک والے مکان کے سامنے پہنچا تو ایک نظر اُس نے اوپر گھما کر دیکھا۔ دریچے میں موہنا چُپ چاپ کھڑی تھی۔ جیب نے سر نیچا کر لیا اور بارات کے ساتھ چلنے لگا۔ دو ہی قدم گیا تھا کہ دریچے میں سے کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ پلٹ کر

دیکھا تو موہنا گلی کے فرش پہ خاک و خون میں لتھڑی پڑی ہے۔ ساری گلی میں کہرام مچ گیا۔ بڑی شرم کی بات تھی۔ بڑی بدنامی کی بات تھی۔ بہت بڑی بات تھی۔ کہ موہنا نے ایک موچی کے لئے جان دے دی۔ کیسی نا ممکن، کیسی غلط، کیسی غیر سماجی حرکت تھی یہ۔ ہر طرح کی رسم و روایت کو توڑنے والی۔ اُن دونوں میں کوئی بات تو مشترک نہ تھی۔ یہاں تک کہ حبیب پڑھا لکھا تک نہ تھا۔ پھر یہ کیسی محبت تھی کہ موہنا نے آج تک کبھی حبیب پہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کہ وہ اُس سے محبت کرتی تھی۔ کیسا احمقانہ فعل تھا۔ وہ گلی کے پکّے اینٹوں والے فرش پہ دم توڑ رہی تھی اور اُس کا سر حبیب کی گود میں تھا۔ بہت جلدی حبیب کے رشتہ داروں اور گلی کے ہندو اور مسلم بزرگوں نے (خدا اُن کی رُوحوں کو جنّت بخشے اور جنّت کے سوا اور کہیں جگہ نہ دے) موہنا اور حبیب کو الگ کر دیا۔ حبیب کے ٹال کی لکڑیوں سے موہنا کی چِتا جلی اور حبیب نے شادی سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد برسوں میں وہاں رہا۔ حبیب نے شادی نہیں کی۔ وہ سُوکھ کے دُبلا ہو گیا۔ اُس کا دماغ بھی تھوڑا سا اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ کیونکہ اُس کے بعد اُس کا دستور ہو گیا تھا۔ کہ وہ لکڑیوں کے ٹال پہ ہی سوتا تھا اور بہت کم لوگوں سے بات کرتا تھا۔ کبھی چاندنی راتوں میں جب ہم آخری شو دیکھ کر سینما سے واپس آتے تھے تو حبیب کو ٹال کے باہر کھڑی چارپائی پر اکڑوں بیٹھا دیکھتے تھے۔ اُس کی نگاہیں فرش پر اُسی جگہ گڑی ہوتیں، جہاں موہنا نے گر کر جان دی تھی۔

اس کے بعد میں نے حبیب کے منہ سے کبھی شعر نہیں سُنے۔ شاید جس دن موہنا جلی تھی اُس نے بھی سارے شعر جلا دیئے تھے۔ میں نے شعر کئی بار سُنے ہیں، پڑھے ہیں۔ مگر جلتے ہوتے صرف ایک بار دیکھتے ہیں۔

حبیب کے ٹال کے ساتھ چندو پان والے کی دوکان تھی اور چندو پان والے کے ساتھ غلام قادر رنگ ساز کی دوکان تھی اور یہ دونوں دوکانیں گلی کے کونے پر واقع تھیں۔ چندو کے پان مجھے آج تک یاد ہیں کتنے میٹھے پان ہوتے تھے وہ۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ پان کھا رہے ہیں یا رس گُلے کھا رہے ہیں۔ آج کل تو پنجاب میں بھی پان کا فیشن بدل گیا ہے۔ لوگ چائے پینے لگے ہیں اور کڑوے کسیلے پان کھانے لگے ہیں۔ بھئی! ایسے پانوں سے تو یہی بہتر ہے کہ کونین کی گولی نگل لی جاتے۔ اُن دنوں چندو ایک آنے کا آدھا پان دیتا تھا اور بیچ میں سے دو ٹکڑے کر کے اُس پر کتھ کی ہوائیاں پھیر کر اس طرح بُلند آواز میں "پچھنے" کہتا کہ چاروں طبق روشن ہو جاتے تھے۔ چندو "چکھیے" کی جگہ ہمیشہ "پچھنے" کہتا تھا اور اُسے سُن کر کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ لغت میں کسی لفظ کا اضافہ ہوا ہے۔ ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ صحیح تلفظ "پچھنے" ہی ہے اور "چکھیے"، جو ہے وہ بے حد گنوار اور اُجڈ لفظ ہے۔ جسے صرف بد ذوق آدمی استعمال کرتے ہوں گے۔

غلام قادر رنگ ساز کو میں کبھی گردانتا نہ تھا اور اُس سے زیادہ بات چیت کرنا بھی اپنی کسرِ شان سمجھتا تھا جس طرح آج بھی بہت سے لوگ لاہور کی

گلبوں میں قدم رکھنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ عزّت کے مختلف مدارج ہیں مگر میں نے اپنی زندگی کے مختلف تجربوں سے دیکھ لیا ہے۔ کہ عزّت ہے بہت گھٹیا چیز۔ جس کے پس پردہ بہت سے پست جذبے اور نام و نمود کی مصلحتیں پنہاں ہیں۔ کچھ اپنی باتوں سے مجبور رہو کہ میں غلام قادر رنگ ساز کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی؟ حالانکہ مجھے اکثر آتے جاتے سلام کیا کرتا تھا۔ کیونکہ اُسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس لڑکے کو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے۔

غلام قادر کو لکھنے پڑھنے کا شوق نہ تھا۔ وہ تو الف، بے سے بے بہرہ تھا اور صرف کپڑے رنگتا تھا۔ مگر غلام قادر بہت عمدہ رنگائی کرتا تھا محلے بھر کی بیبیوں کے کپڑے اُس کے ہاں آکر رنگے جاتے تھے۔ گلی کی سب عورتیں اُس کی دوکان پر آتی تھیں۔ مگر کیا شرافت تھی غلام قادر کی آنکھوں میں؟ وہ سانولے رنگ کا ایک وجیہہ اور باوقار جوان تھا۔ مگر بہن اور ماں کے القاب کے بغیر کسی عورت سے خطاب نہ کرتا تھا۔ صرف اُس کی زبان پہ ہی نہیں۔ اُس کے دل میں بھی شرم تھی اور ایک عجیب قسم کے تقدّس اور معصومیت سے اُس کا دل ہمیشہ لبریز رہتا تھا۔ مگر جو کمی رومان کی اُس کی زندگی میں تھی وہ اُس نے دوسری طرح سے پوری کر لی تھی۔ غلام قادر کے پاس کہانیوں کا خزانہ تھا۔ وہ بچوں کی پریوں کی داستانیں نہ تھیں۔ موجودہ دور کی رنگین داستانیں تھیں۔ جنہیں وہ خود تخلیق کرتا تھا اور اپنے یار دوستوں کو سُناتا تھا۔

ایک دفعہ میری جیب میں پیسے کم تھے اور مجھے اپنے کالج کا بلیزر رنگائی کے لئے کہیں دینا تھا۔ ناچار میں غلام قادر کی دوکان پر گیا۔ غلام قادر نے میرا کوٹ مفت میں رنگ دیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ میں اُس کی کہانی سنوں گا اور اگر وہ کہانی اچھی ہوئی تو اُسے کسی فلم کمپنی میں لگوا دوں گا۔

میں خود اُن دنوں فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا اور فلم تو کیا ادب کے چکر سے بھی محفوظ تھا۔ مگر میں نے اپنا کوٹ رنگوانے کے لئے اُس سے یہ سودا کر لیا۔ کوٹ رنگوانے کے بعد میں نے تین گھنٹے بیٹھ کر غلام قادر کی ایک کہانی سُنی - افوہ! کس قدر بور کہانی تھی وہ - بالکل ایسی جیسی آج کل ہم فلموں میں دیکھتے ہیں۔

وہ کہانی غلام قادر رنگ ساز، سکنہ چوک متی، اندرون لوہاری دروازہ، لاہور نے خود تخلیق کی تھی۔ کس چاؤ سے اُس نے مجھے وہ کہانی سُنائی۔ اُس کی گول گول پُتلیاں کس طرح بار بار کبھی حسرت سے، کبھی مسرّت سے، کبھی خوف سے، کبھی انتقام سے گھومتی تھیں اور وہ اپنے ہاتھ سے مُکّا کس کر ہوا میں اس طرح لہراتا تھا جیسے طبلِ جنگ پر چوٹ پڑی ہو۔ اور ایک لشکر جرار کسی غیر ملک پر فتح حاصل کرنے جا رہا ہو۔

مجھے اُس کی کہانیاں بالکل پسند نہیں آئیں کیونکہ میں ایک پڑھا لکھا، باشعور، مغرور نوجوان تھا۔ ایک رذیل رنگ ساز کی کہانیاں کیسے پسند کرتا۔ چنانچہ میں نے غلام قادر سے کہہ دیا کہ اُس کی کہانی بہت بری ہے اور اُسے

کسی فلم کمپنی کا مالک نہیں خریدے گا۔

غلام قادر ایک آہ بھر کر چُپ ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ کوٹ کو رنگا تو اُس کے پیسے بھی نہیں مانگے میری کسی بات کی تردید بھی نہیں کی۔ وہ صرف ایک ٹھنڈی آہ بھر کر چُپ ہو گیا اور تانبے کے اُس بڑے برتن کی طرف دیکھنے لگا، جہاں نیلے رنگ کے پانی میں کسی کی بیوی کا دوپٹہ غرق تھا۔

چند ماہ کے بعد میں نے دیکھا کہ غلام قادر کی دوکان بند ہے۔ اس کے بعد برسوں میں نے اُس کی دوکان کو بند دیکھا۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ غلام قادر بمبئی میں ہے۔ پھر پتہ چلا کہ غلام قادر نے بمبئی میں کئی فلمی کہانیاں بیچی ہیں۔ اور اب وہ ہزاروں روپے کما رہا ہے۔

اسی طرح کئی سال گذر گئے۔ میں نے ایم۔ اے کر لیا۔ ایل ایل۔ بی بھی کر لیا۔ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ غلام قادر کی دوکان کھُلی ہے اور وہ اُسی طرح تانبے کے تسلے میں دوپٹے رنگ رہا ہے اور لوگوں کی بھیڑ لگی ہے اُسے دیکھنے کے لئے۔

"کیوں؟" میں نے غلام قادر کو سلام کرتے ہوئے کہا۔ "قادر چاچا! فلم کی نگری کیوں چھوڑ آئے؟"

"فلم سازی سے رنگ سازی بہتر ہے بابو!" غلام قادر نے کہا اور اپنے تسلے پر مسکراتے ہوئے جھک گیا۔ اُس کی مسکراہٹ بڑی بلیغ تھی۔

گلی سے چوک کو جاتے ہوئے راستے میں بچن سنگھ بڑھئی کی دوکان تھی۔ جو ہر روز شراب پیتا تھا۔ ہر روز اپنی بیوی کو پیٹتا تھا اور بڑھیا فرنیچر بناتا تھا۔ لوگ اُسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن اُس کا فرنیچر اتنا عمدہ اور سستا ہوتا تھا کہ لوگ اُس سے فرنیچر خریدنے پر مجبور تھے ــــ سیالکوٹ کا وکرم تھا جو مریم کی مورتیاں بناتا تھا اور رادھا کرشن کی بھی ذرا آگے جاکر جے۔ ایس۔ سنت سنگھ کی کتابوں کی دوکان تھی جے۔ ایس سنت سنگھ قرآن مجید چھاپتے تھے۔ اُن کے پاس اگر چھ پیسے کا اُردو قاعدہ خریدنے بھی جانا پڑے تو جوتے باہر اُتار کر دوکان میں داخل ہونا پڑتا تھا وہاں بھورے بھورے کاغذوں پر میلی میلی جلدوں کے اندر سینکڑوں کتابیں تھیں۔ جن سے بانس کی سوندھی سوندھی مہک آتی تھی۔ وہ خیال جو تاریخ کا حصہ بن گئے، وہ خیال جو آج بھی سینے میں شرافت کی طرح کبھی کبھی کروٹ لیتے ہیں اور دوکان کی دیوار سے لگا ہوا لکڑی کے بکسے کو سامنے رکھے ایک بڈھا منیم آنے پائیاں اس تقدّس سے گنتا تھا۔ جیسے وہ آنے پائیاں نہیں، مالا کے منکے گن رہا ہو۔

جے۔ ایس۔ سنت کے بہت آگے دھنونتری کی دوکان تھی۔ دھنونتری کہنے کو ایک حکیم تھا۔ لیکن پتھر کی کھرل میں بارود پیستا تھا۔ بم بناتا تھا اور انقلاب کی باتیں کرتا تھا۔ نوجوان اور جوشیلے دھنونتری کی دوکان کے سامنے بے بس اور مجبور سی، آتی۔ ڈی کے سپاہیوں کا مجمع لگا رہتا۔ وہ لوگ، اُسے خوفزدہ نگاہوں سے

دیکھتے۔ اُس سے اپنی ڈائری بھرواتے، اور موقعہ بہ موقعہ اُس کا بستر اٹھا کر بھی اُس کے پیچھے چلتے تھے۔ ہماری ان آنکھوں نے انگریزی راج کی عزّت و حرمت کو اپنی گلی میں سر بازار لُٹتے دیکھا۔ جب کہ اس گلی سے باہر بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہنے والے انگریزوں کے گھر ڈنڈے کھانے کو سرمایہ صد افتخار سمجھتے تھے۔

بچّن سنگھ نے گورو نانک جنم دن پہ ایک گورو پرب کیا تھا۔ چوک متی کو دلہن کی طرح سجایا تھا۔ وہ شام مجھے نہیں بھولتی۔ لوہاری دروازے سے مولانا ظفر علی خاں کا جلوس آیا تھا۔ شاہ محالمی سے پانڈہ سنت رام کا اور پرانے کنوئیں والی گلی سے سردار سردول سنگھ کویشر کا جلسہ گورو پرب کا تھا مگر تقریریں سب مغربی استعماریت کے خلاف ہوئیں۔ ان تقریروں میں جوش تھا، غصّہ تھا اور آزاد ہونے اور آباد رہنے کی بھرپور تمنا تھی۔

کون کہتا ہے وہ بھرپور تمناؤں والی گلی آج بھی آباد نہیں۔ میرے ذہن میں میلبب آج بھی لکڑیوں کے ٹال پہ بیٹھا ہے اور فرش پہ اپنی محبت کی چتا کو جلتے دیکھ رہا ہے۔ وتے کے بیٹے جوان ہو گئے ہیں اور اپنے ملک کی آزادی کو اپنی مضبوط باہوں کی چھاؤں میں لئے ہوئے ہیں اور غلام قادر رنگ ساز تانبے کے تسلے پہ اکڑوں بیٹھا اودے، دھانی، بسنتی کپڑے رنگتے ہوئے اور اُن کہانیوں کے خواب دیکھتا ہے جنہیں فلم سازوں نے اپنی اغراض کی چتا پہ جلا دیا۔ پرانے گھروں میں کچھ نئے لوگ آ گئے ہیں جو جہاں جہاں گیا ہے، اپنی گلی ساتھ لیتا گیا ہے۔ یہ گلی جس کا آسمان تنگ ہے اور کمرے تاریک

ہیں، بڑی روشن امیدوں والی گلی ہے یہ شہیدوں کی گلی ہے۔ جہاں وطن کی اُلفت اور محبّت کی عصمت کی خاطر انسان نے اپنا لہو دیا ہے۔ جہاں چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے والے لوگوں نے بڑی بڑی مسرّتوں کی آرزو کی ہے اور ان کو بڑے بڑے ہجوموں نے مل کر تکمیل تک پہنچایا ہے۔ یہ گندی گلی، میلی گلی، اُجلی گلی، کمزور گلی، بہادر گلی، بدبودار گلی، مہکتی ہوئی گلی، ان پڑھ گلی، کتابوں سے بھری ہوئی گلی یہ گلی میرے سینے میں ہمیشہ آباد رہتی ہے۔ جب کبھی انسانیت میں میرا ایمان ڈگمگانے لگتا ہے میں اس گلی کی خاک کو اپنی آنکھوں سے لگا لیتا ہوں اور پھر زندہ ہو جاتا ہوں اس لئے میرا یہ عقیدہ ہے کہ جتنے انسان ہیں وہ اس گلی میں رہتے ہیں اور جتنے آسیب ہیں، وہ اس گلی سے باہر رہتے ہیں۔

شریمتی جی

مدیر محترم!

معافی چاہتا ہوں کہ اس بار آپ کے سالگرہ نمبر کے لئے مضمون نہ بھیج سکا۔ قصّہ یہ ہوا کہ جب پہلی بار آپ کا خط آیا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ امسال آپ نے اپنے چند پرانے لکھنے والوں کو ایک ہی موضوع پر مضمون لکھنے کے لئے آمادہ کیا ہے اور وہ موضوع ہے "بیوی" اپنے خاوند کی نظر میں، تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اتفاق سے میری بیوی بھی اُس وقت میری کرسی کے پیچھے کھڑی میری ڈاک کی نگرانی کر رہی تھی۔ کیونکہ مجھے ڈاک سے اکثر لڑکیوں کے خطوط آتے رہتے ہیں۔ اس لئے بیوی کے لئے ڈاک کی نگرانی اور میرے لئے جان بچانی مشکل ہو جاتی ہے بہرحال وہ ایک الگ موضوع ہے اس پہ پھر کبھی فرصت میں بات ہو گی۔ اس وقت تو میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ آپ کا خط پڑھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی تو میری بیوی نے پوچھا کہ کیوں ہنسے؟

میں نے کہا: "یہ ایک ایڈیٹر صاحب ہیں۔ جو بیوی پہ خاوند کی نظر سے ایک

مضمون مانگتے ہیں۔"

"کس کی بیوی پر کس کے خاوند کی نظر سے مضمون مانگتے ہیں؟" اُس نے فوراً پوچھا۔

میں نے کہا۔۔۔"اگر کسی دوسرے کی بیوی پر مضمون مانگا ہوتا۔"

"جب تو تم فوراً لکھ دیتے۔۔۔۔" بیچ میں بات کاٹ کر بولی۔

"ذرا ٹھہرو، منّا رو رہا ہے۔ میں اس کو دو طمانچے لگا کے ابھی آ کے تم سے بات کرتی ہوں۔"

جب وہ واپس آئی تو میں نے کرسی ذرا پرے کھسکا لی۔ بولی "ہاں! اب بتاؤ۔"

میں نے کہا۔۔۔"دراصل مجھے تم پر ایک مضمون لکھنا ہے، اپنے زاویہ نگاہ سے اسی لئے میں ہنس رہا تھا کہ بھلے مانس ایڈیٹر اتنا بھی نہیں جانتے کہ شادی ہونے کے بعد میاں کا زاویہ نگاہ بھی وہ ہو جاتا ہے جو بیوی کا ہوتا ہے۔ پھر وہ بے چارہ جو کچھ بھی دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے، بات کرتا ہے، ہوٹل میں جاتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، چلتا ہے، بیٹھ جاتا ہے، بیٹھ کر پھر چلنے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ اُس کی بیوی کے نقطۂ نظر سے ہوتا ہے۔ البتہ شادی سے پہلے میاں کا ایک نقطہ نظر ضرور ہوتا ہے۔ لیکن شادی کے بعد البتہ چلا جاتا ہے۔ صرف نقطہ نظر رہ جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد نظر بھی چلی جاتی ہے، صرف نقطہ رہ جاتا ہے۔"

میری بیوی نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔۔۔"کیا یہ ایڈیٹر کنوارا ہے۔۔؟"

میں نے حیرت سے پوچھا۔۔۔"تم نے یہ کیسے جانا؟"

اُس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ بولی ــ" شکل وصورت کیسی ہے ــ؟"

" دیکھنے میں تو اچھا ہے۔ مگر۔۔۔۔۔"

" کماتا کیا ہے ؟" وہ میری بات اَن سُنی کر کے بولی۔

" تین سو روپے ملتے ہیں۔"

" تو بہت ہوتے۔ تم نے تو کسی مہینے مجھے ڈھائی سو روپے لا کر نہیں دیئے۔ تم اپنی لڑکی کی شادی کی بات اس سے کیوں نہیں کرتے ہو ؟"

" بھلی مانس !" میں نے حیرت سے کہا " وہ مضمون مانگ رہا ہے۔ میں اُسے اپنی لڑکی دے دوں۔ اس طرح سے تو وہ سال میں تین تین بار سالگرہ نمبر نکالے گا۔"

" مذاق مت کرو۔" وہ غصے سے بولی ــ" گھر میں جوان جہان لڑکی کنواری بیٹھی ہے اور تمہیں اس کی فکر نہیں ہے جب دیکھو بے فکر قلم چلایا کرتے ہو۔ میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔"

وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے میرے کمرے سے باہر چلی گئی۔ دو تین دن تک میرا موڈ بھی بگڑا رہا۔ کئی بار آپ کا مضمون لکھنے کو بیٹھا۔ لیکن قلم چلا ہی نہیں۔ چوتھے دن آپ کی اسسٹنٹ ایڈیٹر مجھ سے مضمون مانگنے آگئیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ جب آپ ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو اسسٹنٹ ایڈیٹر رکھتے ہیں تو اُسے شادی شدہ لکھکوں کے گھر میں کیوں بھیجتے ہیں ؟ اور لپ اسٹک غازہ وغیرہ سے مسلح کر کے کیوں بھیجتے ہیں ؟ آپ کی اسسٹنٹ نے گھر سے

اودے رنگ کی کنجی ورم کی بڑھیا ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں شانتی نکیتن کا چرمی بیگ تھا۔ کانوں میں پکھراج کے آویزے تھے۔ آپ اُسے تنخواہ کیا دیتے ہیں؟

میں نے مضمون تو لکھا نہیں تھا۔ اس لئے وہ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی اور میں بہت دیر تک اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کی قسمت کی لکیریں دیکھتا رہا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ میں بہت عمدہ پامسٹ ہوں اور لڑکیوں کا ہاتھ تو بہت ہی اچھا دیکھتا ہوں۔

خیر! تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلی گئی۔ اُسی دوران میں ہی میری بیوی نے پردے کے پیچھے سے تین چار بار جھانک بھی لیا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو اُس نے پوچھا ــــ

"یہ کون تھی؟ کیا تھی؟ کس لئے آئی تھی؟"

میں نے کہا ــــ "لڑکی تھی، اسسٹنٹ ایڈیٹر تھی، وہی مضمون مانگنے آئی تھی۔"

"تم نے لکھ کے دے دیا؟"

"لکھا ہی نہیں تھا۔ کیا دیتا؟"

"ہاں ہاں! تم مضمون مجھ پر کیوں لکھو گے؟" وہ جھلا کر بولی ــــ "میں تمہاری کون ہوتی ہوں۔ تم باہر کی جانے کیسی کیسی عورتوں پر لکھتے رہتے ہو۔ لیکن گھر کی عورت پر، اپنی بیوی پر تم سے کیوں مضمون لکھا جائے گا۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ آنے دو اس چڑیل کو دوبارہ میں اُس کی چُٹیا نہ کاٹ کے پھینک دوں۔"

وہ زور زور سے رونے لگی۔ میں نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر اُس سے پیار کیا

بہلایا، پُچکارا، سنبھالا، بڑی مشکل سے اُس نے اپنے آنسو روکے۔ انہیں پُونچھتے پُونچھتے بولی۔

"تو تم مجھ سے پیار کرتے ہو نا؟"

"دنیا میں سب سے زیادہ۔"

"مجھ پر مضمون لکھو گے نا؟"

"ضرور!"

"اچھا سا مضمون۔"

"بہت بڑھیا لکھوں گا۔"

اب وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرا دی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

بولی ـــ "میری ایک تصویر بھی چھاپ دینا۔"

"تصویر ــــ؟"

"کیوں؟" وہ ایک دم بھڑک کر بولی "کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگتی ہوں؟"

"بہت اچھی لگتی ہو ڈارلنگ!"

"تو پھر"

"بہت اچھا! تصویر بھی چھپ جائے گی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تو تصویر کھنچوانے کب چلو گے؟"

"آج ہی چلو نا۔"

وہ بے حد خوش ہو گئی۔ پھر ایک دم بُجھ سی گئی۔ بولی ـــ "مگر میرے پاس
تو کوئی نئی ساڑھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "ابھی پچھلے ہفتے ....."

وہ بولی ـــ "وہ تو پچھلے ہفتے کی ہے۔ نئی تو نہیں ہے۔"

"بے شک نئی تو نہیں ہے۔" میں نے اقرار کیا۔

وہ بولی ـــ "میں نئی ساڑھی میں تصویر کھنچواؤں گی۔"

میں نے اُسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ "اتنا ٹنٹنا کیوں کرتی ہو۔ وہ اپنی پرانی
تصویر بھیج دینا۔ جو بنارسی ساڑھی میں ہے۔"

"واہ واہ! وہ تو شادی کی تصویر ہے۔ بائیس برس ہو گئے۔ تم بھی کیا بات
کرتے ہو!"

میں نے کہا۔ "اچھا تو بازار سے ساڑھے سترہ روپے کی وائیل کی ساڑھی لے
لیں گے۔ آج کل پھولدار وائیل کی بہت عمدہ ساڑھیاں آتی ہیں۔"

وہ چیخ کر بولی ـــ "میں وائیل نہیں لوں گی۔ میں تو کُنجی ورم کی ساڑھی لوں
گی۔ ویسی اُودے رنگ کی جیسی اُس کلمو ہی نے پہن رکھی تھی۔"

"کُنجی ورم کی ساڑھی؟" میرا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔ گھٹیا سے گھٹیا کنجی ورم
بھی اسّی، نوّے سے کم نہیں آتی۔

"ہاں! کنجی ورم کی ساڑھی لوں گی ـــ وہی والا بیگ جو اُس چھنال نے لے

رکھا تھا اور ویسے ہی سینڈل، ویسا ہی بلاؤز، پیور میسور سلک کا جھم جھماتا بلاؤز۔ اور کانوں کے ایسے ہی آویزے اور میں ٹیکسی میں بیٹھ کر تصویر کھنچوانے جاؤں گی۔ بس میں نہیں جاؤں گی۔ ابھی سے کہے دیتی ہوں۔ نہیں تو میرا سارا لباس خراب ہو جائے گا۔ ہاں۔''

اس واقعہ کے تین چار دن بعد آپ کی اسسٹنٹ ایڈیٹر ایک نیا لباس پہن کر میرے گھر آئی تو میری بیوی نے کہہ دیا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ اس کے تین چار روز بعد جب وہ پھر آئی تو میں پُونہ گیا ہوا تھا۔ اس کے بعد احمد آباد گیا تھا۔ پھر ناسک گیا ہوا تھا اس کے بعد وہ نہیں آئی۔ اُس نے سوچا ہو گا ناسک جا کر کون لوٹتا ہے۔ یتر بتھ دھام ہے۔

مضمون تو میں لکھ نہیں سکا۔ بیوی کی تصویر آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اشتہاروں کے کسی صفحے پر چھاپ دیجئے گا۔ ساتھ میں بل بھی روانہ کر رہا ہوں تفصیل یہ ہے :۔

کنجی ورم کی ساڑھی	—	ایک سو پچیس روپے
پیٹی کوٹ (سلک کا)	—	اکیس روپے
سینڈل	—	ساڑھے پندرہ روپے
بلاؤز (بنگلور آرٹ)	—	اٹھارہ روپے دس آنے
آویزے	—	ایک سو پینتیس روپے

ٹیکسی	—	نو روپے نو نئے پیسے
سینما	—	چھ روپے
دہی بڑے کی چاٹ	—	ڈیڑھ روپیہ

میزان کُل ۹—۱۰—۳۲۹ روپے

بل کی ادائیگی فوراً ہونی چاہیئے۔ کیونکہ میں نے یہ روپے ایک پٹھان سے قرض لئے ہیں۔ ورنہ آپ کو میری مرہم پٹی کا خرچہ بھی دینا پڑے گا۔ اس لئے بل فوراً ادا کر دیجئے۔ اور آئندہ مضمون مانگتے وقت ادیب کی جیب کا خیال رکھیئے۔

فقط آپ کا

کرشن چندر

نقشِ فریادی

CHARCTERS

کردار

۱- نجمہ :-	نوجوان غصیلی لڑکی
۲- خالہ :-	نجمہ کی خالہ۔ ادھیڑ عمر کی۔
۳- ٹھاکر سنگھ :-	ایک نوجوان انجنیئر۔ تیز کٹیلا لہجہ۔
۴- پرویز :-	دوسرا نوجوان انجنیئر۔ میٹھا، مردانہ۔ بھاری لہجہ۔ لہجے میں شاعری اور رومانیت ہونا چاہیئے۔
۵- ایرک لڈوگ :-	ایک جرمن انجنیئر۔ آواز میں اجنبی پن۔
۶- مقام :-	پانہال ٹنل۔ کشمیر
۷- زمانہ :-	زمانہ حال

پہلا منظر

سری نگر سے بانہال کو جاتی ہوئی پہاڑی چڑھائی کا ایک موڑ۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو چھوٹا سا موڑ اور موڑ پر کھلے برآمدے والا ایک پرانا مکان نظر آ رہا ہے۔ مکان سے سیڑھیاں اُتر کر سڑک تک آتی ہیں اور سڑک مکان کے نیچے سے گھوم کر جاتی ہے۔ مکان کے برآمدے میں ایک نوجوان لڑکی ایزل پہ ایک تصویر بنانے میں مشغول ہے۔ لڑکی اس قدر حسین نہیں ہے، جس قدر ذہین نظر آتی ہے۔ اُس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے ہیں۔ اُس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں اور اُس کے باریک کبھی کبھی ایک طنزیہ مسکراہٹ میں کھل جانے والے ہونٹ اُس کے چہرے پر عجیب دلکشی عطا کرتے ہیں۔

جب پردہ اُٹھتا ہے تو نیچے سڑک پر سے دو نوجوان مکان کے روڈ کی جانب آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہٹا کٹا سنگھ اونچا۔ لانبا پورے قد کا ڈوگرہ راجپوت نوجوان ہے۔ اُس کا رنگ گندمی ہے۔ آنکھیں سیاہ اور غصیلی اور اُس کی چال میں ایک عجیب طرح کی بے صبری پائی جاتی ہے۔ باتیں کرتے ہوئے بھی وہ اپنے مفہوم کو زیادہ واضح کرنے کے لئے اپنے ہاتھوں سے بلیغ لیکن بے چین اشارے کرتا ہے۔ اُس کا ساتھی درمیانے قد کا کشمیری نوجوان پرویز ہے۔ اُس کا رنگ بے حد صاف اور لہکتا ہوا ہے۔ رخساروں پر سیب کی سی رنگت

دمک رہی ہے۔ آنکھیں نیلی، ماتھا فراخ اور سر کے بال اُڑے اُڑے سے، اُس کی باتوں میں ٹھہراؤ، چال میں متانت اور وقار ہے وہ ایک گمبھیر مزاج کا نوجوان معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔

دونوں چلتے چلتے رک جاتے ہیں اور مکان کی طرف پیٹھ موڑ کے سیٹج کی جانب کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔

پرویز :۔ دیکھو سری نگر کتنی دُور رہ گیا۔

ٹھاکر سنگھ :۔ اور یہ دھان کے کھیت کس طرح دھند میں لپٹے ہوتے ہیں۔

پرویز :۔ گویا خوابوں میں کھو گئے ہوں۔

ٹھاکر سنگھ :۔ اور یہ شمشاد اور بید مجنوں کے درخت سر اُٹھا کر کیسے کھڑے ہیں؟

گویا کسی کے بُلاوے کے منتظر ہوں۔

پرویز :۔ ٹھاکر سنگھ!

ٹھاکر سنگھ :۔ ہاں پرویز!

پرویز :۔ کیا تم اور میں کبھی دوست نہیں ہو سکتے۔

ٹھاکر :۔ کبھی نہیں!

پرویز :۔ کیا تم میرے ساتھ یا نہال ٹنل پہ کام نہیں کرو گے؟

ٹھاکر :- جو ٹنل میرے دل میں سے گزر کر نہیں جا سکتی، اُس پر میں کام کیوں کروں گا؟ میں سیدھا جموں اپنے گھر جاؤں گا۔

پرویز :- تم مجھ سے نفرت کرتے ہو؟

ٹھاکر :- تم سے نہیں، تمہاری ذات سے نہیں۔ تمہارے تصورات خیالات اور تمہارے کلچر کے اُن تمام اجزائے ترکیبی سے جن سے تمہاری شخصیت مرتب ہوئی ہے۔

پرویز :- اسی طرح اگر میں بھی تم سے، تمہارے تصورات سے، خیالات سے اور تمہارے کلچر سے نفرت کرنے لگوں تو یہ دونوں نفرتیں کہاں پر جا کر ختم ہوں گی؟

ٹھاکر :- مسٹر پرویز! میں نے دُنیا کے مسائل کو حل کرنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ یہ بحث تم مجھ سے بارہا کر چکے ہو۔ کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔

پرویز :- تم اپنے گھر جا رہے ہو ٹھاکر سنگھ! اور میں بانہال ٹنل پر کام کرنے جا رہا ہوں۔ کچھ عرصہ کے لئے ہم دونوں اس سڑک پر ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ محبت اور نفرت ایک ہی سڑک پر۔ کیسی عجیب زندگی ہے!

ٹھاکر :- اب میں تمہیں اس سڑک پر چلنے سے تو منع نہیں کر سکتا۔ مگر

شکر ہے بہت جلد آگے جا کر ہمارے راستے الگ الگ ہو
جائیں گے وہ سامنے چوٹی کے قریب گھر دیکھتے ہو نا۔ وہ
گلابی پھولوں والا۔ عشق پیچاں کی بیلوں سے گھرا ہوا گھر اُس گھر
سے ہمارے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ تم پگڈنڈی سے
یا تھال ٹنل کو جاؤ گے۔ میں موٹر روڈ پہ کھڑا ہو کر کسی لاری
کا انتظار کروں گا۔ کم بخت اگر میری لاری فیل نہ ہو گئی ہوتی
تو مجھے تمہارے ساتھ یہاں تک بھی پیدل نہ چلنا پڑتا۔

پرویز :۔ دشمن ضرور ہو۔ مگر کم سے کم صاف گو دشمن تو ہو مجھے یہ چیز
پسند ہے ٹھاکر۔

ٹھاکر : کچھ باتیں تمہاری بھی مجھے پسند ہیں پرویز! مگر تم کھوئے
ہوئے ناممکن خواب دیکھنے والے احمق ہو۔ ذرا اپنے
خوابوں کو حقیقت کی چٹانوں سے ٹکرانے دو۔ ٹکڑے ٹکڑے
ہو جائیں گے۔

(چلتے چلتے دونوں گھر کے قریب آجاتے ہیں)

پرویز :۔ دیکھو یہ گھر آگیا جہاں سے ہمارا تمہارا راستہ الگ ہوتا ہے۔

ٹھاکر :۔ مگر برآمدے میں یہ تصویر کون بنا رہا ہے ؟

پرویز :۔ ایک لڑکی ہے۔

ٹھاکر:۔ مگر کس قدر خوب صورت ہے!

پرویز:۔ کون؟ لڑکی یا تصویر؟

ٹھاکر:۔ لڑکی۔

پرویز:۔ اچھا ٹھاکر سنگھ! خدا حافظ!

ٹھاکر:۔ دیکھو نہیں پرویز! ۔۔۔۔ اے ۔۔۔۔ اے ۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ میں تھک گیا ہوں۔

پرویز:۔ (طنزاً) خیال اچھا ہے۔

ٹھاکر:۔ اگر کہیں سے ایک پیالہ چائے کا مل جائے تو ۔۔۔

پرویز:۔ (طنزاً) یہ خیال اس سے بھی اچھا ہے۔

ٹھاکر:۔ مذاق مت کرو۔

پرویز:۔ ٹھہرو! میں تصویر بنانے والی خاتون سے پوچھتا ہوں۔

" :۔ (بلند لہجے میں) محترمہ!

نجمہ:۔ (اوپر برآمدے میں سے دیکھ کر) جی فرمائیے!

پرویز:۔ دیکھئے ہم دونوں مسافر ہیں۔ اور ہمیں بہت پیاس لگ رہی ہے۔

نجمہ:۔ پیاس لگ رہی ہے تو دو قدم آگے بڑھ جائیے۔ ٹھنڈے پانی کا چشمہ مل جائے گا۔

پرویز:۔ اے ..... اے .... دیکھئے محترمہ! ہمیں اس وقت پانی کی پیاس نہیں، چائے کی پیاس ہے۔ اگر.....

نجمہ:۔ اگر آپ اسی راستے سے آدھا فرلانگ اور آگے جائیں گے تو آپ کو ایک عمدہ ٹی سٹال ملے گا۔ خدا حافظ!

ٹھاکر سنگھ:۔ (بے دلی سے) خدا حافظ!... کم بخت بات بھی نہیں کرتی سیدھے منہ سے۔

پرویز:۔ تو تمہیں اس سے کیا۔ تم جاؤ اپنے گھر جموں۔

ٹھاکر: جموں بہت دور ہے؟

پرویز:۔ اور یہ تصویر بہت نزدیک ہے۔

ٹھاکر:۔ ہاں!

پرویز:۔ یعنی بالکل الگ الگ سوچنے پر بھی کبھی ہم دونوں اکٹھے پیاسے ہو سکتے ہیں۔

ٹھاکر:۔ پھر وہی بے کار کی بحث .... (بلند آواز میں) محترمہ! کیا آپ کو مصوری میں پی کاسو کا سٹائل پسند ہے؟

نجمہ:۔ نہیں!

ٹھاکر:۔ تو پھر گوگاں پسند ہوگا۔

نجمہ:۔ ہرگز نہیں!

ٹھاکر:۔ تو غالباً ماتیس؟

نجمہ:۔ بالکل نہیں!

ٹھاکر:۔ تو پھر آپ شاید اوستوسکی کو پسند فرماتی ہوں گی؟

نجمہ:۔ گدھے ہیں آپ۔

ٹھاکر:۔ بجا فرمایا آپ نے۔

نجمہ:۔ اوستوسکی مصور نہیں تھا جناب!

ٹھاکر:۔ نہیں ہوگا۔ حالانکہ وہ الفاظ سے مصوری کرتا تھا۔ آپ برش اور رنگ سے کرتی ہیں۔ مگر اوستوسکی کی روح میں جو کرب تھا، وہ آپ کی آنکھوں سے نمایاں ہے۔

نجمہ:۔ آپ لوگ چائے پینے کے لئے اوپر برآمدے میں آسکتے ہو ادھر سے سیڑھیاں چڑھ کر آیئے (آواز دے کر) خالہ!۔ خالہ!!

خالہ:۔ آئی!

نجمہ:۔ دو مہمان آئے ہیں خالہ! چائے پی کر جائیں گے۔

پرویز:۔ چلو بھائی کام بن گیا۔ آرام سے بیٹھ کر چائے پئیں گے۔ جب تک وہ لاری مرمت ہو کے آجائے گی۔

(پرویز سیٹی بجاتا ہوا ٹھاکر سنگھ کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا ہے)

(سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آکے دونوں تصویر کو غور سے دیکھنے لگتے ہیں)

ٹھاکر سنگھ:- عجیب بھیانک اور تاریک تصویر ہے یہ۔

پرویز:- زمین میلی۔ آسمان گدلا۔ اشجار مایوسی میں کھوئے ہوئے محترمہ! اس تصویر کا کیا نام ہے؟

نجمہ:- شفق جو ڈوب گئی ہے

پرویز:- بہت خوب! اور آپ کا نام کیا ہے؟

نجمہ:- نقش فریادی!

پرویز:- جی کیا فرمایا؟

نجمہ:- کہا نا میرا نام نقش فریادی ہے۔

ٹھاکر سنگھ:- (آہستہ سے) پاگل معلوم ہوتی ہے۔

(خالہ چائے لے کر آتی ہے)

خالہ:- میری بھانجی کا نام نقش فریادی نہیں ہے۔ نجمہ ہے۔ مگر ایک حادثے کے بعد اس نے اپنا یہی نام رکھ لیا ہے۔

ٹھاکر:- وہ حادثہ کیا تھا؟

خالہ:- یہ یٹو سکول آف آرٹس میں پڑھتی تھی۔ اس کے والد اپنے علاقے کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ جب قبائلیوں کا حملہ ہوا تو وہ اس میں مارے گئے۔ ان کے بعد اقربا

اور لاقانونی کا ایک زمانہ آیا۔ کیونکہ زمیندار کا علاقہ سرحد پر تھا۔ قبائلیوں کے جلنے کے بعد اس کی ماں کو یعنی میری بہن کو دوسرے مذہب والوں نے اغوا کر لیا۔ جب یہ گھر پہنچی تو سب جل چکا تھا۔ ساری آرزوئیں، سب اُمیدیں . . . .
کیا تم نے کسی نوجوان لڑکی کی امیدوں کو جلتے ہوئے دیکھا ہے؟

نجمہ۔ وہ آج بھی جل رہی ہیں . . . خالہ مجھے چلے جانے دو۔

خالہ :۔ اُس دن سے اس لڑکی کا اعتماد انسانیت سے اُٹھ گیا ہے۔ اب اُس کا کوئی نام نہیں ہے۔ یہ اپنے آپ کو نقشِ فریادی کہتی ہے۔

پرویز :۔ کچھ سُنا تم نے ٹھاکر سنگھ ؟

ٹھاکر سنگھ :۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اِدھر جموں کی وادی ہے۔ اُدھر کشمیر کی وادی ہے۔ بیچ میں بانہال کا پہاڑ ہے۔

پرویز :۔ پہاڑوں کے جگر بھی کٹ سکتے ہیں۔ اگر انسان کا ارادہ مضبوط ہو۔

نجمہ :۔ ان باتوں میں کوئی دم نہیں ہے مسٹر!

پرویز :۔ مجھے پرویز کہتے ہیں۔ میرے دوست کا نام ٹھاکر سنگھ ہے۔

ہم دونوں میکینیکل انجنیئرنگ کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں ہیں تو
اب بانہال ٹنل پہ کام کرنے جا رہا ہوں۔ یہ میرا دوست
جموں جا رہا ہے۔ اسے اس ٹنل سے سخت نفرت ہے۔

نجمہ:۔ نفرت ہو یا محبت۔ تاریکی ہو یا روشنی۔ ابتدا ہو یا آخر۔ نتیجہ
ہر بات کا مایوسی ہے۔

پرویز:۔ تو پھر تم مصوّری کیوں کرتی ہو ــــ؟

نجمہ:۔ صرف تصویریں میرے دل کی زبان سمجھ سکتی ہیں۔

پرویز:۔ انسان بھی سمجھ سکتے ہیں مس نجمہ!

نجمہ:۔ نقشِ فریادی کہو!

پرویز:۔ (زور دے کر) مس نقشِ فریادی! انسان کے دل سے بہترین
مصوّر کوئی نہیں ہے۔ اُس سے بڑا اُجالا بھی کہیں نہیں ہے۔
ایک لاکھ سورج مل کر بھی اُس کی تابانی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

نجمہ:۔ غلط بالکل غلط! انسان کے دل میں ہمیشہ تاریکی اور نفرت
کا راج رہا ہے وہ دوسرے کو دکھ پہنچا کے ہنستا ہے۔ اُس
کی ہر خوشی کسی دوسرے کی لاش پہ کھڑی ہو کر فخر سے بلند
ہو جاتی ہے۔

پرویز:۔ تم عورت ہو کر ایسا کہتی ہو؟

نجمہ :- میں عورت نہیں ہوں، صرف ایک نقش ہوں۔

ٹھاکر سنگھ :- مگر کسی قدر حسین نقش!

نجمہ :- کیا کہا مسٹر ٹھاکر؟

ٹھاکر :- کچھ نہیں محترمہ! میں .... میں .... اس تصویر کے نقش و نگار کی تعریف کر رہا تھا۔

پرویز :- اس قدر حسین ہو کر کے اندر کتنا تاریک دل چھپا ہوا ہے - تم عورت ہو کر اپنے دل میں ایک پتھر رکھتی ہو۔ کیا اس دنیا میں صرف تمہارے ساتھ ہو رہا ہے؟ کیا تمہاری طرح اس دنیا میں لاکھوں، کروڑوں انسان ایسے نہیں ہیں جن کی ہر آرزو اور ہر امید اور ہر پیار کو روند روند کر مسلا گیا ہے وہ پھر آرزو کے بیج بوتے ہیں اور محبت کی فصل اُگاتے ہیں۔

نجمہ :- (غصہ سے) یہ لیکچر بند کرو اور چائے پی کر دفع ہو جاؤ۔

پرویز :- (غصے میں آکر) میں خود تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔

نجمہ :- میں کہاں تمہاری صورت کو ترستی ہوں۔

خالہ :- نجمہ!

نجمہ :- نقش فریادی کہو خالہ! میرا نام مت بھول جایا کرو مسٹر پرویز! آپ جا سکتے ہیں!

پرویز:- (غصّے سے) خدا حافظ!

نجمہ:- (غصّے سے) خدا حافظ!

پرویز غصّہ میں جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کر سڑک پر چلتے ہوئے موڑ سے غائب ہو جاتا ہے۔ نجمہ برآمدے سے جھک کر اُسے دیکھتی رہتی ہے جب تک وہ نظروں سے غائب نہیں ہو جاتا۔

نجمہ:- تمہارا دوست چلا گیا۔

ٹھاکر سنگھ:- میرا دوست نہیں تھا۔ دشمن تھا۔ اُس کے خیال سے میرا کوئی خیال لگاؤ نہیں کھاتا۔

نجمہ:- یہ ٹنل پر کیا کرے گا؟

ٹھاکر سنگھ:- کہتا ہے پہاڑوں کا جگر چیروں گا۔ ایک وادی کو دوسری وادی سے ملا دوں گا۔

نجمہ:- احمق ہے۔ تم پہاڑوں کا سینہ چیر سکتے ہو۔ ایک انسان کے دل کو دوسرے انسان کے دل سے نہیں ملا سکتے۔

ٹھاکر:- میں تم سے اتفاق کرتا ہوں مس نقش فریادی! ہر انسان ایک جزیرہ ہے وہ اپنے خیالات، تصوّرات، مذہب اور کلچر کا قیدی ہے۔ رواداری ایک ڈھونگ ہے۔ کل عالمی یک جہتی ایک خواب ہے۔

نجمہ :- ہاں! میں جانتی ہوں۔ تاریکی ہی ایک حقیقت ہے۔ اندھیرا ہی آخری سچائی ہے۔ محبت خود غرضی کی آخری جائے پناہ ہے۔ تہذیب ایک خوش رنگ میک اپ ہے۔ جو انسان کی..... کے چہرے کو چھپانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے میں سب دیکھ چکی ہوں۔ سب دیکھ رہی ہوں۔

ٹھاکر سنگھ :- مگر عورت ہو کہ تم ایک پہاڑ کی چوٹی پہ اکیلی کیوں رہتی ہو؟

نجمہ :- کیونکہ مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔

ٹھاکر :- پھر تو تمہیں اپنے آپ سے بھی نفرت ہو گی۔

نجمہ :- (جھڑک کر) ہاں! ہاں!! ہاں!!! — اب تم نے سب سُن لیا ہے، اب تم یہاں کیوں ٹھہرے ہو۔ چلے جاؤ.. چلے جاؤ۔

ٹھاکر سنگھ :- میں پھر آؤں گا۔ کیونکہ تم اور میں بالکل ایک سا محسوس کرتے ہیں۔

نجمہ :- (طیش میں آکر) میں تمہیں دھکے مار کر باہر نکال دوں گی۔ چلے جاؤ۔ مجھے کسی انسان کی ضرورت نہیں ہے۔

(طنزاً) آداب عرض ہیں..... نقش فریادی!

(ٹھاکر سنگھ باہر جانے کے لئے مُڑتا ہے۔ پردہ گرتا ہے)

دُوسرا منظر

ایک چھوٹی سی کاٹیج کا خوشنما ڈرائنگ روم۔ کمرہ مغربی ڈھنگ سے سجا ہوا ہے۔ صحیح مغربی ڈھنگ سے یہ آتش دان میں لکڑیاں جل رہی ہیں۔ کھڑکیوں پہ پردے پڑے ہیں۔ لیکن ایک کھڑکی آدھی کھلی ہے۔ یکایک اس آدھی کھُلی کھڑکی کی راہ سے تیز ہوا کا جھونکا آتا ہے اور کھڑکی زور سے کھڑکھڑاتی ہے اور پردہ زور سے لہراتا ہے اور ٹیبل پہ رکھے ہوئے کاغذات وغیرہ منتشر ہو جاتے ہیں۔ پرویز جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کاغذات سنبھالنے لگتا ہے نقشے اور بلوُ پرنٹ وغیرہ۔ ایک صوفے میں ایک جرمن انجنیر ایلورک لڈوگ آنکھوں پہ چشمہ چڑھائے اندر کو دھنسا ہوا پائپ پی رہا ہے۔ موٹا بھاری آدمی ہے۔ سر مُنڈا ہوا ہے۔ فولاد رنگ آنکھوں میں کبھی تو مضبوطی کی چمک عیاں ہوتی ہے اور کبھی وہ خوابوں میں کھو جاتی ہیں۔ ہوا کے جھکڑ کو اندر آتے دیکھ کر وہ صوفے سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے پرویز سے بات کرتا ہے۔

پرویز:۔ طوفان آرہا ہے۔

لڈوگ:۔ (اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) کھڑکی بند کر دو پرویز! نہیں تو اندر بیٹھے بیٹھے سردی سے جم جائیں گے۔

پرویز:۔ لڈوگ کیا تمہارے جرمنی میں ایسی ہی شدید سردی پڑتی ہے؟

لڈوگ :۔ اس سے بھی زیادہ۔

پرویز:۔ کیا وہاں ایسی ہی برف باری ہوتی ہے۔ جیسی ہمارے بانہال پہ ہوتی ہے۔

لڈوگ :۔ اس سے بھی زیادہ۔

پرویز :۔ تم لوگ جرمنی میں برف سے ڈرتے نہیں ہو؟

لڈوگ :۔ ہم لوگ برف سے پیار کرتے ہیں۔ یہ سفید بے داغ برف کے تروتازہ گالے انسان کے دل کی طرح خوبصورت ہیں؟ پرویز!

پرویز :۔ ہاں لڈوگ! جب معیار زندگی بلند ہو تو ایسی ہی شاعری سوجھتی ہے۔ ہمارے ہاں جب بانہال پر برف آتی ہے تو غریبوں کے دل خوف سے بھر جاتے ہیں۔ جانتے ہو لڈوگ برف کا کیا مطلب ہے۔ برف کا مطلب ہے گرم کپڑا۔ گرم کمبل۔ گرم لحاف۔ زیادہ لکڑی۔ زیادہ کوئلہ۔ زیادہ چائے۔ ہم لوگ برف سے بہت ڈرتے ہیں۔ یہ برف ہمیں بہت مہنگی پڑتی ہے۔ یہ برف جو دونوں وادیوں کے راستے کاٹ دیتی ہے اور چیزوں کو مہنگا کر دیتی ہے۔

لڈوگ :۔ جب بانہال کی ٹنل تیار ہو جائے گی تو برف انسان کا راستہ نہ روک سکے گی۔ اس لئے تم ایک کشمیری انجنیئر

اور میں ایک جرمن انجینئر، دونوں اس ٹنل پر کام کر رہے ہیں۔
تاکہ دونوں وادیوں کے دل ایک دوسرے سے مل جائیں۔

پرویز:۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں لڈوگ! کتنی ہی ایسی وادیاں ہیں۔
جو ایک دوسرے سے دور ہیں۔ کتنے ہی ایسے تاریکیوں کے
پہاڑ ہیں، جن کا جگر چاک کر کے ہمیں روشنی کی نہر کو لانا ہے۔

لڈوگ:۔ انجینئری بھی ایک طرح کی شاعری ہے۔

پرویز:۔ مگر بڑی سنگلاخ زمین میں کی جاتی ہے اور کبھی کبھی تو قافیہ
اس قدر تنگ ہو جاتا ہے کہ ڈائنامیٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔

(دونوں ہنستے ہیں۔ یکایک جھکڑ زور کا چلتا ہے۔ اور طوفان کی آواز
میں دور سے ایک چیخ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ دونوں چونک پڑتے ہیں)

پرویز:۔ یہ کس کی آواز تھی؟

لڈوگ:۔ کوئی نہیں ہے پرویز! طوفان کی چیخ ہے۔

(طوفان کے جھکڑ میں پھر ایک چیخ سنائی دیتی ہے۔ ایک نسوانی
چیخ پرویز چونک کر اٹھتا ہے)

پرویز:۔ یہ تو کسی عورت کی آواز معلوم ہوتی ہے۔

لڈوگ:۔ طوفان کبھی کبھی عورت کے بھیس میں چیختا ہے۔ کوئی بدروح
ہو گی۔ جو طوفان میں ناچ رہی ہے۔ باہر مت جاؤ پرویز!

ہمارے ملک میں جب طوفان آتا ہے تو اسی طرح روحیں چیختی ہیں۔کوئی گھر سے نہیں نکلتا۔کہاں جا رہے ہو پرویز؟

(پرویز کے قدموں کی آواز۔ دروازہ زور سے بند ہوتا ہے)

[ایرک اپنے شانے ہلاتا ہے اُس کا پائپ بجھ گیا ہے۔وہ اُسے پھر سے سُلگاتا ہے۔کھڑکی کھول کر باہر دیکھتا ہے۔باہر سے طوفان کے تیز فراٹوں میں اُسے بھی وہی آواز سنائی دیتی ہے۔]

آواز:۔ بچاؤ! بچاؤ!!

(آواز فیڈ آوٹ ہو جاتی ہے۔پرویز کے بھاگنے کی آواز)

(پھر آواز طوفان میں قریب آجاتی ہے۔اب کوئی قریب سے کہتا ہے)

آواز:۔ بچاؤ!... بچاؤ!!... بچاؤ!!!

قدموں کے دُور جانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ایرک لڈوگ چند لمحے کھڑکی پر جُھکا کھڑا رہتا ہے۔سوچ میں ڈوبا ہوا۔پھر وہ باہر جانے کے لئے اپنا بڑا گرم کوٹ کھونٹی سے اُتار کر پہننے لگتا ہے کہ اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور پرویز بے ہوش نجمہ کو اپنے بازوؤں میں اٹھائے داخل ہوتا ہے۔

پردہ

تیسرا منظر

(وہی پرویز اور لڈوگ کا ڈرائنگ روم)

لڈوگ، پرویز، اور نجمہ بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔

لڈوگ:۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ اس طوفان میں گھر سے باہر کیوں نکلیں؟

نجمہ:۔ مجھے طوفان پسند ہے۔ جب بادل گرجتے ہیں، بجلی چمکتی ہے اور ساری دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ اُس وقت میرے دل کو بڑا سکون ملتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قہرالٰہی ساری دنیا کو اسی طوفان میں غارت کر دے گا۔

لڈوگ:۔ آپ دُنیا کی تباہی پر خوش ہوتی ہیں۔

نجمہ:۔ جس دُنیا نے مجھے تباہ کیا ہے، اُس کی تباہی پر میں خوش کیوں نہ ہوں؟

پرویز:۔ طوفان ختم گیا ہے۔

نجمہ:۔ اسی بات کا مجھے افسوس ہے۔ طوفان آتا ہے۔ مگر ختم جاتا ہے۔

پرویز:۔ بادل چھٹ جاتے ہیں، سورج نکل آتا ہے۔ دھوپ اپنی سنہری کرنیں بکھیرنے لگتی ہے۔ مس نقش فریادی! دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ کبھی کبھی طوفان ضرور آتے ہیں۔ ایک

لمحے کے لئے دُنیا تاریک بھی ہو جاتی ہے مگر....؟ مگر آخر
میں سُورج ضرور نکلتا ہے۔

نجمہ:۔ میں جانتی ہوں۔اسی لئے میں نے اپنی تصویروں میں پناہ
لی ہے۔میری پیاری خوبصورت ہیبت ناک تاریک ڈراؤنی
تصویریں مجھے پسند ہیں، ان تصویروں میں کسی سورج کا گزر
نہیں ہوتا۔

پرویز:۔ ایک دن تمہارے دل میں محبت اپنے ہاتھوں میں سورج کے
کنول جگمگاتے ہوئے آئے گی۔اُس روز کیا کرو گی مس نقش فریادی!

نجمہ:۔ شٹ اَپ!

لڈوگ:۔ آپ پرویز سے اس طرح گفتگو کیوں کرتی ہیں۔اس آدمی نے
آپ کی جان بچائی ہے۔

نجمہ:۔ تو میں نے تو نہیں کہا تھا کسی کو۔میری جان بچالے۔کیا کسی کا
شکریہ ادا کرنے کی خاطر میں اپنے اُصول بدل دُوں؟
اپنے خیالات سے دستبردار ہو جاؤں؟

پرویز:۔ میں ایسا تو نہیں کہتا!

نجمہ:۔ (غصّے میں آکر) پھر آپ کیا کہتے ہیں؟

پرویز:۔ میرے خیال میں یہ بحث بے کار ہے، آپ بہت کمزور ہیں۔

لیٹ جائیے۔ آرام کیجئے۔

نجمہ:۔ نہیں میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں اپنے گھر جاؤں گی۔

لڈوگ:۔ کیا آپ کو ہم پر بھروسہ نہیں ہے ؟

نجمہ:۔ مجھے کسی مرد پر بھروسہ نہیں ہے۔

پرویز:۔ دیکھئے میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔ اس حالت میں آپ مت جائیے۔ ہم دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ آپ کمرے کے اندر کی چٹخنی لگا کر یہاں لیٹ جائیے۔ آرام کیجئے۔

نجمہ:۔ چٹخنیاں کھولی جا سکتی ہیں۔ دروازے توڑے جا سکتے ہیں۔

پرویز:۔ مس نقش فریادی! ہم بھیڑیئے نہیں ہیں۔ انسان ہیں۔

نجمہ:۔ بھیڑیوں اور انسانوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ . . ہٹو! مجھے جانے دو۔

(نجمہ تیز قدموں سے چلی جاتی ہے۔ دروازہ زور سے بند ہوتا ہے)

لڈوگ:۔ بڑی گستاخ لڑکی ہے۔ بدتمیز۔

پرویز:۔ (آہستہ سے) مجھے اچھی لگتی ہے۔

لڈوگ:۔ کیا کہا ؟

پرویز:۔ یہی لڈوگ کہ انسان کے دل کے اندر ابھی کتنی ہی تنگ و تاریک گپھائیں ایسی ہیں۔ جہاں کبھی روشنی کا گذر نہیں ہوتا۔ ٹنل ـــــ

ٹنل ۔۔۔ لڈوگ وہ ٹنل ہم ضرور بنائیں گے۔

لڈوگ :۔ (کھڑکی سے باہر دیکھ کر) سورج نکل آیا ہے۔ چلو کام پر چلیں۔

پرویز :۔ چلو!

پردہ

چوتھا منظر
نجمہ کا گھر

نجمہ تصویر بنا رہی ہے اور گنگنا رہی ہے۔ گنگناتے ہوئے چُپ ہو جاتی ہے اور خالہ سے مڑ کر کہتی ہے۔

نجمہ :۔ خالہ! کالا رنگ ختم ہو گیا۔ اندر سے کالے رنگ کی ٹیوب اُٹھا لاؤ۔

خالہ :۔ یہ ہوا کالا رنگ۔ جب دیکھو کالا رنگ۔ جب تجھے کالا رنگ اس قدر پسند ہے تو اسے سارے کینوس پر کیوں نہیں پوت دیتی ہو۔

نجمہ :۔ کوشش تو کرتی ہوں خالہ! جاؤ نا اندر سے کالے رنگ کی ٹیوب اُٹھا لاؤ۔

خالہ:۔ (بڑبڑاتے ہوئے) یہ موا کالا رنگ تو ہماری جان کو آ گیا اب کالا رنگ کہاں سے لاؤں؟ رزاق کو سری نگر بھیج رکھا ہے۔ وہ لیکے آئے گا۔

(خالہ بڑبڑاتے ہوئے اندر جاتی ہے۔ نجمہ پھر تصویر بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ نیچے سڑک پر سے آواز آتی ہے)

ٹھاکر سنگھ:۔ ہیلو نقش فریادی!

نجمہ:۔ (جھک کر دیکھتی ہے) ہیلو.... ٹھاکر سنگھ۔ جموّں سے لوٹ آئے)

ٹھاکر سنگھ:۔ چائے نہیں پلاؤ گی؟

نجمہ:۔ کیوں نہیں پلاؤں گی؟ آؤ وہ زینہ چڑھ کے آ جاؤ.... کہو ٹھاکر سنگھ! تمہارے دوست کا کیا حال ہے؟

ٹھاکر سنگھ:۔ پرویز کا؟.... وہ تو میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔

نجمہ:۔ ڈیڑھ ماہ سے [illegible] سے ملاقات نہیں ہوتی۔ ہاں ایک روز طوفان میں مل گیا تھا۔

ٹھاکر سنگھ:۔ کیا کہتا تھا؟

نجمہ:۔ کچھ بھی کہتا ہو۔ میں نے اُس کی بے عزّتی کر دی۔ مجھے مردوں کی بے عزّتی کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔

ٹھاکر سنگھ:۔ ہوں!

(دُور سے مزدوروں کے گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر دور ہو جاتی ہے)

ٹھاکر سنگھ :- معلوم ہوتا ہے ٹنل پر کام ہو رہا ہے۔

نجمہ :- (غصّے سے) دن رات ہوتا رہتا ہے۔ ڈبل شفٹ کرتے ہیں یہ لوگ رات کو سونے نہیں دیتے۔

(زور سے ایک دھماکے کی آواز آتی ہے)

ٹھاکر :- یہ کیا تھا؟

نجمہ :- ڈائنامیٹ کا دھماکہ تھا۔ ٹنل پر بورنگ کا کام جاری ہے۔ دن رات دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔ میں تو عاجز آ گئی۔ سوچ رہی ہوں یہاں سے چلی جاؤں۔

ٹھاکر :- سری نگر چلو میرے ساتھ۔

نجمہ :- سری نگر میں بہت انسان ہیں۔

ٹھاکر :- انسانوں سے دشمنی تو اچھی چیز ہے۔ لیکن اُن سے بے رُخی تو اچھی نہیں ہوتی۔

نجمہ :- جو تم کہنا چاہتے ہو، وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ تمہارا جموں کا ٹرپ کیسا رہا؟

ٹھاکر :- بہت اچھا رہا۔ میں اپنے دوستوں میں تھا۔ اپنے ہم خیال لوگوں میں تھا پھر بھی...!

نجمہ :- رُک کیوں گئے؟

ٹھاکر :- پھر بھی مجھے اس گھر کی عشق پیچاں کی بیلیں یاد آتی رہیں۔

نجمہ:۔ ہر خوبصورت یاد کو کدال سے کھود کر دل سے نکال دینا چاہیئے۔ ٹھاکر سنگھ۔ ورنہ دل کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔

ٹھاکر:۔ تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو نقش فریادی! کیا تم نہیں جانتی ہو کہ دشمن کا دشمن اپنا دوست ہوتا ہے؟

نجمہ:۔ میرے لئے سب دشمن ہیں، ہر مرد عورت کے حسن کا دشمن ہوتا ہے عورت کا حسن مرد کی جنس کی خوراک ہے۔ وہ اسے اسی طرح کھاتا اور پیتا ہے جیسے تم یہ چائے کی پیالی پی رہے ہو۔

ٹھاکر۔ عورت اور چائے کی پیالی میں کچھ تو فرق ہوگا؟

نجمہ:۔ مرد کی نگاہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(زور کا دھماکہ ہوتا ہے)

ٹھاکر:۔ اُف کتنا بڑا دھماکہ تھا!

نجمہ:۔ ہاں! ٹنل پہ بورنگ کا کام جاری ہے۔ احمق ہیں یہ لوگ

ٹھاکر:۔ یہاں تو میں بھی تم سے اتفاق کرتا ہوں۔۔۔ مگر تم نے اپنی یہ تصویر ابھی تک مکمل نہیں کی کس قدر خوبصورت تصویر ہے یہ کالے کالے بادلوں میں چھپا ہوا یہ لبس سورج۔ یہ پہاڑوں پہ تاریک سائے۔ جیسے ہر طرف تاریک سائے۔ جیسے ہر طرف موت منڈلا رہی ہو یہ چوٹی پہ کھڑا ہوا ایک پیڑ کا تاریک تنا اور اس کی ننگی سیاہ شاخیں

کیا اس درخت پر پتے نہیں ہوں گے۔

نجمہ:- (فیصلہ کن لہجے میں) نہیں! اس درخت پر کبھی پتے نہیں آئیں گے؟

(بہت سے لوگوں کی آوازیں جو قریب ہوتی جاتی ہیں)

نجمہ:- یہ شور کیسا ہے؟

ٹھاکر:- یہ لوگ ادھر کیوں آ رہے ہیں؟

نجمہ:- یہ چارپائی پہ کسے اُٹھا رکھا ہے؟

نجمہ:- (چیخ کر) پرویز ۔۔۔۔! پرویز ۔۔۔۔!!

(لوگ پرویز کو اُٹھا کر برآمدے میں لاتے ہیں۔ اُسے ایک دیوان پر لٹا دیا جاتا ہے)

نجمہ:- پرویز! تمہیں کیا ہوا ۔۔۔ مسٹر لڈوگ!

لڈوگ:- ٹنل کی آخری چٹان پر کام ہو رہا تھا۔ یہ چٹان بہت بھیانک اور خطرناک تھی۔ اندر سے پانی رس رس کر بہت پھسلن ہو رہی تھی۔ کوئی مزدور وہاں فیتہ لگانے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ مگر بے قرار پرویز آج ہی ٹنل کا آخری سرا دیکھنے کے لئے بے قرار تھا اور چٹان کو آج ہی پھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اس لئے میرے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود پرویز ہاتھ میں فیتہ لے کر آگے بڑھ گیا۔ احتیاط تو اس نے بہت کی تھی مگر چٹان پر بہت پھسلن تھی۔ واپسی میں پاؤں پھسل گیا۔ اُدھر چٹان بھک سے

اُڑ گئی اور چٹان کا ایک بڑا ٹکڑا اُس کے منہ پہ آ لگا۔ ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔

نجمہ:۔ یہ بچ جائے گا۔ یہ بچ جائے گا! پرویز۔۔۔ پرویز۔۔ تم نے اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈالا۔ چند پتھروں کو توڑنے کے لئے۔

پرویز:۔ مِس نقش فریادی! میں نے ٹنل کا آخری سرا دیکھ لیا ہے۔ بھاکڑہ سنگھ میں نے دونوں وادیوں کو مِلا دیا ہے۔ انسانوں کے درمیان منافرت کی دیوار کی دھار کو کاٹ کے پھینک دیا ہے۔ ارے وہ کس قدر خوبصورت لمحہ تھا! آخری چٹان بھک سے اُڑ گئی اور دوسرے کنارے سے تنگ و تاریک سرنگ میں روشنی کی تھر اندر دوڑتی چلی آئی۔

نجمہ:۔ پھر تم یہاں کیوں آئے پرویز! محض اپنی فتح جتانے کے لئے۔

پرویز:۔ (آہستہ سے مسکرا کر) میں تمہارے چہرے پر روشنی دیکھنا چاہتا تھا۔

نجمہ:۔ پرویز!

پرویز:۔ میں تمہاری تصویر میں امید کا رنگ بھرنا چاہتا تھا۔

نجمہ:۔ (سسکیاں لے کر) پرویز!

پرویز:۔ تمہارے دل کے اندر جتنے زخم ہیں، وہ سب میں نے دیئے ہیں۔ لیکن میرے ہی پاس ان زخموں کا مداوا ہے۔ تاریک سرنگ کے خوف ناک سایوں میں تمہارے زخموں نے ہر لحظہ میرے عزم کو استوار کیا ہے اور ہر لحظہ تمہارا ہی چہرہ میرے سامنے رہا ہے۔

مرنے سے پہلے میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا اس لئے۔۔۔

نجمہ:۔ زیادہ باتیں نہ کرو پرویز! تمہارے سینے سے لہو بہہ رہا ہے۔

پرویز:۔ اسے بہنے دو۔ یہ روشنی کا لہو ہے۔ یہ ہر وادی میں جلتے گا اور ہر دھرتی پہ پھیلے گا۔ کیا تم اس لہو کو اپنے دل میں جگہ نہ دو گی مس نقش فریادی؟

نجمہ:۔ نجمہ کہو پرویز! مجھے نجمہ کہو۔

پرویز:۔ آہ!

نجمہ:۔ پرویز۔۔ پرویز۔۔۔ مسٹر لڈوگ! اسے کیا ہو رہا ہے؟

پرویز:۔ (آہستہ سے) دیکھو۔۔ وہ ٹنل کھل گئی۔۔۔ نجمہ۔۔۔۔ دیکھو روشنی آ گئی۔۔۔۔ روشنی۔۔۔ روشنی۔۔ روشنی۔۔۔۔

(دم توڑ دیتا ہے)

نجمہ:۔ (آہستہ سے) پرویز۔۔ پرویز۔۔۔ آہ!

(آہستہ آہستہ سسکیاں لے کر روتی ہے۔ اداس موسیقی بہت دھیرے سروں میں بلند ہوتی ہے)

ٹھاکر سنگھ:۔ مسٹر لڈوگ! تمہیں پرویز کی جگہ ٹنل پر کام کرنے کے لئے ایک انجنیئر کی ضرورت ہوگی؟

لڈوگ:۔ ہاں!

ٹھاکر سنگھ :- میں کل سے کام پر آ رہا ہوں۔

لڈوگ :- تھینکس ٹھاکر سنگھ!

خالہ :- (برآمدے میں آ کر) نجمہ! وہ رزاق سری نگر سے کالے رنگ کی ٹوپیاں لے آیا ہے۔

[نجمہ یکایک آنسو پونچھ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور رزاق سے کالے رنگ کی ٹوپیاں لے کر انہیں باہر پھینکنا شروع کر دیتی ہے۔]

خالہ :- کیا کر رہی ہو نجمہ؟

نجمہ :- خالہ! گھر کے اندر جتنے کالے رنگ کی ٹوپیاں ہیں، سب کو باہر پھینک دو۔ اور جتنی ہرے رنگ کی ٹوپیاں ہیں۔ انہیں میرے پاس لے آؤ۔ آج میں اس تاریک درخت کی ہر سیاہ شاخ کو ہرے ہرے پتوں سے بھر دوں گی۔

(تیزی سے نجمہ برش سے ہرے رنگ کو گھولنے لگتی ہے۔ امید سے بھری ہوئی موسیقی بجنے لگتی ہے)

فیڈ آؤٹ

سیکنڈ ہینڈ کار

مجھے شروع ہی سے سیکنڈ ہینڈ چیزوں کا شوق رہا ہے۔ بچپن میں استاد جو سبق پڑھاتے تھے، وہ میں خود سے نہ لکھتا تھا بلکہ اپنے کسی ہم جماعت کی کاپی سے نقل کر لیا کرتا تھا۔ گھر سے اسکول کی نئی کتابوں کے لئے جو پیسے ملتے تھے اُن سے نئی کے بجائے سیکنڈ ہینڈ کتابیں خرید لیتا تھا۔ حد یہ ہے کہ ان دنوں میرے دوست بھی سیکنڈ ہینڈ ہوتے تھے۔ یعنی کسی نے تعارف کرادیا تو دوستی ہو گئی۔ خود سے کسی کو دوست بنانے کی کبھی جرأت نہیں ہوتی۔ دراصل میری جو یہ شامت آئی ہے تو بچپن سے آرہی ہے اور اب تک چلی آرہی ہے۔

اب اس کا کیا کیجئے۔ بڑے ہو کر بچپن کی یہی عادتیں اس قدر پختہ ہو جاتی ہیں۔ کہ عادت ثانیہ بن جاتی ہیں اور پھر انسان کو اپنی خامیوں میں مزا آنے لگتا ہے شلمت کی سب سے بڑی یہی علامت ہے۔ اب مجھے دیکھئے۔ جو لطف مجھے کسی پرانی سیکنڈ ہینڈ کتاب سے ملتا ہے وہ کسی نئی کتاب سے حاصل نہیں ہوتا۔

ایک تو سیکنڈ ہینڈ کتاب خریدنے میں کس قدر تردّد کرنا پڑتا ہے۔ گھنٹوں

کباڑیئے کے کوڑے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیئے اور اپنے چہیتے مصنّف کا نام ڈھونڈتے رہیئے اور مایوس ہوتے رہیئے پھر جب مایوس ہو کر کتابوں کے ڈھیر میں سے یوں ہی آپ ایک کتاب اُٹھا لیتے ہیں، جلد غائب، مصنف کے نام کا صفحہ پھٹا ہوا۔ آپ بڑی بے دلی سے صفحے اُلٹتے ہیں۔ یک بیک آپ کی نگاہ رک جاتی ہے اور آپ دفعتاً چونک اُٹھتے ہیں۔ ارے یہ تو وہی کلاسک ہے جسے میں ایک عرصہ سے ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر آپ اپنی خوشی کو چھپاتے ہیں تاکہ کباڑیا آپ کی مسرّت کو دیکھ کر زیادہ دام نہ مانگ لے۔ اس کے بعد کباڑیئے سے جو بھاؤ تاؤ شروع ہوتا ہے۔ اُس کا لطف بھلا کسی نئی کتاب بیچنے والے کے ہاں سے کہاں ملے گا؟ وہاں تو دام مقرّر، مصنّف کا نام معلوم، گرد پوش، صحیح سلامت۔ ہر چیز اس قدر نپی تُلی اصولوں کی پابند کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کتاب نہیں خرید رہے جومیٹری کا سوال حل کر رہے ہیں۔

چنانچہ اب تو یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ کتاب سے کار تک ہر چیز میں سیکنڈ ہینڈ خریدنے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں اور جب سیکنڈ ہینڈ نہ ملے تو نئی لیتا ہوں اور اپنی اس عادت کی وجہ سے مستقل شامت میں گرفتار رہتا ہوں۔

گزشتہ دنوں مجھے ایک گاڑی کی ضرورت تھی۔ نئی موٹروں کے بہت سے ماڈل دیکھے۔ ہر ماڈل ایسا کہ کلیجے سے لگا لینے کے قابل۔ ایک گاڑی دیکھی جو دن میں ڈائننگ روم اور رات میں بیڈ روم کا کام دے سکتی تھی۔ ایک گاڑی میں دو انجن لگے ہوئے تھے کہ ایک فیل ہو جائے تو دوسرا کام کرنے لگے۔ ایک گاڑی دیکھی جس

کا سارا جسم پلاسٹک کا بنا ہوا تھا۔ سنا ہے اگلے سال نائیلون کی بنی ہوئی گاڑیاں آئیں گی۔ جنہیں انجن سے الگ کر کے لانڈری میں دُھلنے تک کے لئے دیا جا سکے گا۔

موٹر بیچنے والوں کے ہاں میری بہت آؤ بھگت ہوتی اُن دنوں موٹر کا دلال بھی خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا ہر جگہ موٹر بیچنے والے شربت، آئس کریم، چائے، پان، سگریٹ سے تواضع کرتے تھے۔ بہت سے بے وقوف جنہیں میری مالی حالت کا پتہ نہ تھا۔ مجھے نئی موٹر قسطوں پر دینے کو تیار تھے۔ مگر میں نے کہیں حامی نہ بھری۔

ڈیڑھ دو ماہ کے چکر لگانے کے بعد ایک روز موٹروں کے دلال نے مجھ سے کہا۔ "آخر آپ کس طرح کی موٹر چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "سنو! میں ایسی موٹر چاہتا ہوں جیسا میں ہوں۔"

وہ بولا:۔ "میں نہیں سمجھا۔"

میں نے کہا۔ "سنو! میں ایک کپ چائے پی لوں تو دن بھر کام کرتا رہتا ہوں۔ ایسی ہی میں موٹر بھی چاہتا ہوں۔ جس میں ایک گیلن پٹرول ڈالوں تو دن بھر چلتی رہے۔ میرا رنگ روپ تم نے دیکھا ہے ایسا تو نہیں ہے کہ اسے دیکھ کر لوگ چونک پڑیں۔ بس یہی موٹر کا رنگ بھی ایسا ہونا چاہیئے جسے دیکھ کر کسی فلم کی ہیروئن کا خیال نہ آئے۔ بلکہ اگر خیال آئے تو یہ آئے۔ آہ! دُنیا فانی ہے اور کیا انسان کی زندگانی ہے۔ ایک لمحے میں بُلبُلہ ہے۔ دوسرے لمحے میں پانی ہے۔"

موٹر کا دلال بولا۔ "بس بس! میں سمجھ گیا! آپ ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدنا

چاہتے ہیں،،

دو ماہ کی تلاش بسیار کے بعد ہم نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی۔ دیکھئے صاحب! اگر آپ اس وقت یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہاں میں سب کے سامنے اپنی گاڑی کی خامیاں بیان کروں گا تو آپ سب غلطی پر ہیں۔ خامیاں کس میں نہیں ہوتیں؟ کون انسان یا کون سی گاڑی ایسی ہے جو خامیوں سے پاک ہے؟ میری سیکنڈ ہینڈ گاڑی میں بھی ہزار چھوٹے چھوٹے نقص ہوں گے مگر صاحب! چلتی ہے۔ اور چلتی کا نام گاڑی ہے۔

میری گاڑی کا رنگ ملگجا اُودا ہے۔ انجن اور مڈگارڈوں پر ملگجا ہے۔ درمیان کی باڈی پر اودا ملگجا ہے اور آخر میں جہاں سامان رکھا جاتا ہے، وہاں بھی ملگجا ہے بلکہ سیاہی مائل ہے۔ کبھی کبھی جب سڑک پر گزرتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں یہ گاڑی چمک اٹھتی ہے۔ حالانکہ اس میں سورج کی کرنوں کو کافی محنت کرنی پڑتی ہوگی۔ پھر بھی صاحب! جب کبھی یہ چمک اٹھتی ہے تو ایک رنگ کے بجائے اس کے کئی رنگ آنکھوں میں بکھر جاتے ہیں۔ شاید میری گاڑی نے اپنی مختصر سی زندگی میں ہر رنگ دیکھا ہے۔ یہ وہ شمع ہے جو ہر رنگ میں جلتی ہے بلکہ چلتی ہے۔

میری گاڑی کی سیٹوں میں اسپرنگ نہیں ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس گاڑی کے پچھلے مالک کے دماغ میں جتنا بھوسہ تھا۔ وہ اس نے اٹھا کر اس گاڑی کی سیٹوں میں بھر دیا ہے۔ مگر صاحب! اس بھوسے کے اوپر چمڑے کی جو سیٹیں ہیں وہ بہت عمدہ ہیں

اور کسی خوشامدی کی کھال کی طرح چکنی اور دبیز ہیں۔

میری گاڑی میں اسپرنگ نہیں ہیں تو کیا ہوا، بریک بھی تو نہیں ہیں۔ حالانکہ سنتے ہیں کہ گاڑی میں بریکوں کا ہونا ضروری ہے۔ مگر ہم نے تو آج تک ان کی ضرورت محسوس نہ کی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری گاڑی بریک ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ اس میں بریک نہیں ہیں۔ مگر صاحب! ہمیں کبھی ان بریکوں کی حاجت نہ ہوتی۔ یہ گاڑی سڑک پہ اس طرح اٹھلاتی ہوئی چلتی ہے کہ آپ بڑے آرام سے گاڑی سے اُتر کر نکڑ کی دوکان سے پان کھا کر پھر اس گاڑی میں بیٹھ سکتے ہیں۔ کسی پہاڑی ٹرین کی طرح۔

جس دن سے میں نے اس گاڑی کو خریدا ہے، ایک نہ ایک مصیبت جان کو لگی رہتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ ہوا کہ میری گاڑی کو بمبئی کی سڑکوں پہ نکلتے دیکھ کر میرے پاس ایک نوٹس آیا محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے وجہ بیان کرو کہ یہ گاڑی تمہارے پاس کیوں ہے؟ اور کیوں نہ اسے ہمارے محکمہ کی تحویل میں دے دیا جائے۔

بڑی مشکل سے میں نے محکمۂ آثار قدیمہ والوں سے پنڈ چھڑایا کہ عجائب گھر والوں نے آن لیا۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ گاڑی ضرور کسی عجائب گھر سے چرائی ہوئی ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں قائل کیا۔

میں اس گاڑی کی تاریخی عظمت سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ جوں ہی میں اسے کہیں بازار میں روک کر کھڑا کرتا ہوں اور خود کسی دوکان میں گھس جاتا ہوں اور سودا لیکے واپس آتا ہوں تو چند منٹوں ہی میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ دیکھنے

کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ مجھے بے حد غصّہ آجاتا ہے۔ ایسا بھی کیا۔ میں کوئی گرا پڑا غیر معروف آدمی نہیں ہوں… لوگ مجھے دیکھتے ہی نہیں۔ بس میری گاڑی کو دیکھتے ہیں اور بڑی حیرت سے دیکھتے ہیں۔ کوئی اسے وہیل مچھلی کا بچہ بتاتا ہے کوئی اسے شترمرغ کی بیٹی سمجھتا ہے۔ اکثر لوگوں کو تو سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ یہ کیا چیز ہے۔

ایک بار کیا ہوا۔ میں چوپاٹی سے گزر رہا تھا اُس دن چوپاٹی پر کسی مشہور لیڈر کا بھاشن تھا۔ میں چوپاٹی کے قریب گاڑی روک کر وہیں بڑے کی چاٹ کھانے لگا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ایک کر کے لوگ لیڈر کے جلسے سے اُٹھ کر چلے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں سارا مجمع میری گاڑی کے گرد آگیا اور وہ مشہور لیڈر چوپاٹی کے ساحل پر اکیلا کھڑا رہ گیا۔

دوسرے دن اُس لیڈر نے مجھ پر ہرجانے اور ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر دیا۔ کیونکہ میں نے اُس کے جلسے کو درہم برہم کر دیا تھا اور اُس کی سیاسی شہرت کو چوٹ پہنچائی تھی۔ بہت بڑا لیڈر تھا۔ بہت بڑے سالسٹر کا نوٹس تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے معافی نامہ دے کر جان بچائی اور اُس دن سے قسم کھا لی کہ جس دن کسی بڑے لیڈر کا جلوس ہمارے شہر میں سے گزرے گا۔ میں کبھی اپنی گاڑی سڑک پر نہ نکالوں گا۔ خواہ مخواہ کسی کی روزی پر لات مارنے سے کیا فائدہ؟

اس گاڑی کی ایک مصیبت یہ ہے کہ اس کے پُرزے کبھی نہیں گھستے اور اگر گھستے ہیں تو پھر ملتے نہیں۔ پہلے انگلینڈ میں ملتے تھے اب وہاں بھی نہیں ملتے۔ اب تو دنیا کے کسی ملک میں

نہیں ملتے۔ جانے کب کی یہ گاڑی ہے اتنے برسوں میں ملکوں اور قوموں کا ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ مگر ہماری گاڑی کا سانچہ نہیں بدلا۔ اب تو میں نکڑ کے لوہار سے خاص طور سے لوہا گلا کر اُس کے پُرزے ہاتھ سے بنواتا ہوں۔ غالباً دنیا میں یہ پہلی گاڑی ہے جس کا ہر پُرزہ ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔

اس گاڑی کی ایک مصیبت یہ بھی تو ہے کہ جہاں اُس نے کسی بس سٹاپ کے کیو میں کسی خوبصورت لڑکی کو کھڑے ہوتے دیکھا، بس وہیں رُک گئی۔ اب میں اسے لاکھ آگے چلاتا ہوں۔ اسٹیرنگ کرتا ہوں، چابی گھماتا ہوں، ریس کرتا ہوں، ہینڈل مارتا ہوں۔ مگر کیا مجال جو یہ گاڑی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلے۔ لیکن جناب! آپ نے اُس خوبصورت لڑکی کو لفٹ دے دی۔ بس یہ گاڑی خود بخود چلنے لگے گی۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ میں انتہائی شریف انسان ہوں۔ مگر اس گاڑی کو کیا کیئے جو اس قدر حُسن پرست واقع ہوتی ہے۔ کبھی اس کانپتی ہوئی رعشہ زدہ گاڑی کی بڈھی آنکھوں یعنی ہیڈ لائیٹس کو دیکھ کر مجھے غالب کا وہ شعر یاد آجاتا ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اس گاڑی کی اور سب مصیبتیں تو میں برداشت کر بھی لوں اور کر بھی لیتا ہوں لیکن اس گاڑی کی سب سے بڑی شامت اس کے پچھلے مالک ہیں۔

ایک بار میں ایک دوست کے بنگلے پر اس سے ملنے کے لئے گیا۔ چند منٹ کا کام تھا۔ فوراً واپس آگیا۔ کیا دیکھتا ہوں، ایک گداگر مسکین صورت پھٹے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا

ایک عجیب انداز سے میری گاڑی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے بھائی؟"
وہ گداگر میری طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ پھر رُک کر رونے لگا۔ میں نے اس گداگر سے کہا ــــ

"اے پیر نیک صورت! تو پہلے ہنسا کیوں پھر رویا کیوں؟ یہ قصہ کیا ہے؟"

اس گداگر نے زور سے ایک آہ بھری اور بولا ــــ "ایک زمانہ وہ تھا جب میں اس گاڑی کا مالک تھا۔ وہ زمانہ یاد کر کے میں ہنسا۔"

"اور روئے کیوں ــــ؟" میں نے پوچھا۔

"رویا اس لئے" وہ گداگر بولا ــــ "کہ جس طرح میرے پاس یہ گاڑی نہ رہی۔ ایک دن تمہارے پاس بھی نہ رہے گی۔"

میں نے گداگر کو دوّنی دی۔ اور گاڑی لے کر آگے بڑھ گیا۔

"ایک بار ایک صاحب ریلوے اسٹیشن کے سامنے مجھے مل گئے اور بولے ــــ "میں اس گاڑی کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا "وارنٹ دکھایئے" بولے "وارنٹ تو نہیں ہیں میرے پاس۔ لیکن یہ جان لیجئے کہ آج سے پچاس سال پہلے میں اس گاڑی کی سیٹ پر ایک روپیہ رکھ کر بھول گیا تھا۔ بعد میں میں نے یہ گاڑی بیچ دی۔ لیکن اس وقت مجھے اس ایک روپے کا خیال نہ رہا۔ بعد میں خیال آیا جب اس کا نیا مالک اسے لے کر چلا گیا۔ بعد میں میں نے اسے کئی بار ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ یہ گاڑی اپنے مالک بدلتی رہی اور میں بھی بمبئی سے باہر چلا گیا تھا۔ آج آیا ہوں۔ غریب نادار مسافر ہوں۔ گاڑی کی

تلاشی دے دیجئے۔ اگر میرا روپیہ مل گیا تو آپ کو جان و مال کی دُعائیں دُوں گا۔"

میں کیا کرتا بھائی؟ اب اجازت دینا پڑی۔ اُس آدمی نے چمڑے کی سیٹیں کھول کر سارا بھوسہ چھان مارا۔ کئی صدیوں کی باس تھی اُس بھوسے میں۔ کہاں وہ اب بھوسہ رہا تھا۔ جس طرح چٹانوں میں لاکھوں سال دبے رہنے سے علم نباتات کے پودے کوئلے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سیٹوں کا بھوسہ بھی کیمیائی عمل سے کوئلے کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ بہت بھوسہ چھاننے کے بعد آخر اُس آدمی کو اپنا روپیہ مل ہی گیا۔ چلاتا کہ بولا "یہ دیکھو میرا روپیہ۔ حلال کا روپیہ تھا۔ اس لئے مل گیا۔"

اُس دن سے میں سوچ رہا ہوں کہ ایک روز اس گاڑی کو سر سے پاؤں تک کھول کے دیکھوں۔ ممکن ہے کسی منچلے نے اس کے اندر کوئی دفینہ چھپا رکھا ہو۔

مگر دفینہ ڈھونڈنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ہوا یہ کہ ایک روز جب میں گھر سے دفتر جانے کے لئے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو آدمی بڑے مزے سے اُس گاڑی سے لگ کر اس طرح آرام سے باتیں کر رہے ہیں، جیسے یہ اُن کے باوا کی گاڑی ہو۔ ایک صاحب جو لانبے تھے۔ دوسرے سے جو چھوٹے قد کے تھے، کہہ رہے تھے —

"تمہیں یاد ہے پیسی! یہ گاڑی ہمارے باوا کی تھی۔"

"یاد ہے۔ اس گاڑی میں تمہارے چار بڑے بھائی بیمار ہو کر ہسپتال گئے تھے۔ اور مرنے کے بعد اسی گاڑی میں واپس گھر لائے گئے تھے۔"

لانبا آدمی بولا: "میرے باپ سے تمہارے باپ نے یہ گاڑی خریدی تھی

مگر دس مہینے میں ہی اُن کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اس گاڑی کو دِلسُکھ بھائی نے خریدا تھا۔ لیکن خریدنے کے آٹھ ماہ بعد اُن کا دیوالہ نکل گیا۔"

"عجیب منحوس گاڑی ہے یار۔ پر اپنے کو کیا اپنے پاس اب تھوڑا ہی ہے۔"

وہ تو یہ گفتگو کر کے چلے گئے۔ میں تھر تھر کانپنے لگا۔ میں اس وقت اس گاڑی کو لے کر مارد ے ریج پر گیا اور اُسے دھکّا دے کر کھڈ کے نیچے گِرا کے چلا آیا۔ گھر آکر بڑے اطمینان کا سانس لیا۔

خس کم جہاں پاک

مگر دوسرے دن ہی ایک خطرناک بھونپو کی آواز سُنائی دی۔ باہر جا کے کیا دیکھتا ہوں کہ وہی برتی برتائی گاڑی صحیح سلامت حالت میں دروازے کے باہر کھڑی ہے اور گنگو کا مستری خوشی سے چلّا کر کہہ رہا ہے — "تمہاری گاڑی ماردے کی کھڈ میں مجھے مل گئی۔ میں اِسے چلا کر یہاں لے آیا۔"

میں نے پُوچھا — "کھڈ میں گر کر بھی یہ نہیں ٹوٹی؟"

"ارے نہیں بھائی! بالکل ٹھیک ہے۔ چاہو تو چلا کر ابھی دیکھ لو۔ ایک پُرزہ کہیں سے نہیں ہلا۔"

"یہی تو سب سے بڑی مُصیبت ہے۔ میں تو اس گاڑی کو چھوڑتا ہوں مگر یہ گاڑی ہی مجھے نہیں چھوڑتی۔"

کرشن چندر

ہم تو محبّت کرے گا

شروع ہی سے مجھے دو چیزیں بہت پسند ہیں۔ خوبصورت جُوتے اور خوبصورت عورتیں۔ ان دونوں میں ایسا کون سا گہرا نفسیاتی تعلق ہے کہ یہ دونوں چیزیں میرے ذہن میں اکٹھی آتی ہیں یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ اگر میرے پاؤں میں خوبصورت جوتے نہ ہوں، تو ہر دم مجھے ایک عجیب سا احساس کمتری کا خیال رہتا ہے اور اگر میری بغل میں خوبصورت عورت نہ بیٹھی ہو، تو مجھے اردگرد کی دُنیا تاریک سی معلوم ہونے لگتی ہے۔

لیکن یہ تو کوئی ضروری نہیں ہے کہ جو چیز آپ کو پسند ہو وہ آپ کو مل بھی جائے۔ بہت سے لوگوں کو ہوائی جہاز میں سفر کرنا پسند ہوتا ہے۔ لیکن وہ زندگی بھر ہوائی جہاز میں سفر نہیں کر سکتے۔ بہت سے لوگوں کو ہیرے کی انگوٹھی پہننے کا شوق ہوتا ہے۔ لیکن انہیں چاندی کا ایک چھلّا تک نصیب نہیں ہوتا۔ اسی طرح بہت سے لوگ پاؤں میں جوتا پہننا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ جوتا پڑتا اُن کے سر پہ ہے۔ اسی کا نام دُنیا ہے اور میں بھی اسی دُنیا میں

رہتا ہوں۔ اور اسی وجہ سے اپنی پسند کی چیز کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔

لیکن حاصل نہ کرنے پر بھی پسند تو اپنی جگہ رہتی ہے اور اس کے لئے انسان کوشش بھی کرتا ہے اور یہی کوشش مجھے ایک بار کھینچ کر شری مدن گوپال کے گھر لے گئی۔ شری مدن گوپال اُدھیڑ عمر کے انڈر سیکرٹری ہیں۔ بارہ سو روپے تنخواہ پاتے ہیں۔ پچاس برس کی عمر ہونے کو آئی۔ لیکن ابھی تک شادی نہیں کی۔ اس لئے ہمیشہ خوبصورت جوتے پہنتے ہیں اور خوبصورت عورت کی صحبت میں رہتے ہیں۔ اُن کا گھر چونکہ میری گلی میں واقع ہے اور اُن کی چھوٹی سی آسٹن گاڑی اکثر میرے گھر کے قریب ہی کھڑی رہتی ہے۔ اس لئے مجھے اُن کی رنگین مزاجی کو دیکھنے کا تجربہ بھی ہے اور بہت قریب سے ہے۔

ایک روز میں ہمت کر کے اتوار کے روز اُن کے گھر چلا ہی گیا اور اُن سے اپنی بپتا کہہ ڈالی۔ انہوں نے بڑے دھیان سے میری باتوں کو سُنا۔ پھر سوچ سوچ کر بولے۔

"میرے خیال میں آپ کو عشق کرنا چاہیئے۔"

"جوتے سے ــــ؟"

"نہیں عورت سے!" وہ مسکرا کر بولے ــــ "کسی بھی خوبصورت عورت سے عشق کر لینا چاہیئے۔"

"مگر ہمارے محلّے میں تو کوئی خوبصورت عورت نہیں ہے۔"

"آپ سمجھے نہیں ہیں۔" مدن گوپال جی مجھے سمجھاتے ہوئے بولے ۔ "جب آپ کسی عورت سے عشق کرنے لگیں گے، پھر وہی عورت آپ کو خوبصورت معلوم ہونے لگے گی۔"

"مگر پھر اُن جوتوں کا کیا ہوگا؟"

وہ بولے۔ "اس کی فکر نہ کیجئے۔ عورت کے آنے سے جوتے خود بخود آ جاتے ہیں۔"

یہ بات بھی ٹھیک تھی۔ مگر کسی نے آج تک مجھے سمجھائی نہ تھی۔ اب مدن گوپال جی نے بتایا تو میری سمجھ میں آیا۔ اور میں نے انہیں اُستاد مان لیا۔ چنانچہ دوسرے دن میں ایک سُود خور پٹھان سے ایک سو روپیہ قرض لے آیا۔ کچھ تھوڑی مٹھائی خریدی۔ تھوڑے سے پھول، بتاشے یہ سب کچھ اُن کے چرنوں میں رکھ کر بولا ——

"آج سے مجھے اپنا شاگرد بنا لیجئے اور مجھے عشق کرنا سکھا دیجئے۔"

مدن گوپال جی نے میری نذر قبول کر لی۔ میرے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ بولے ——"بیٹا! عشق بھی ایک پیشہ ہے جیسے لوہار کا ایک پیشہ ہے، بڑھئی کا ایک پیشہ ہے . . . موٹر مکینک کا ایک پیشہ ہے . . . . عشق بھی ایک علم۔ جیسے بائیو کیمسٹری ایک علم ہے۔ فزکس ایک علم ہے اور سائیکالوجی ایک علم ہے اور ہر علم کی دو شاخیں ہوتی ہیں (۱) تھیوری (۲) تجربہ . . . . . علم

اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا، جب تک انسان اُس کی تھیوری نہ سمجھ لے۔ اور بعد میں تجربے سے اُسے پرکھ نہ لے.....''

''اسی لئے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ گورو دیو! مجھے عشق کا گیان دیجئے..''

''سنو!'' مدن گوپال جی بڑی سنجیدگی کے ساتھ بولے'' عشق کرنے کی دو ترکیبیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ کے پاس پیسہ ہو تو عشق کے بہت سے مرحلے خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس دنیا میں جتنی خوبصورت عورتیں ہیں بے حد نازک اور حساس ہیں اور خوبصورت چیزوں کا احساس تو خاص طور پر قدرت نے اُن کے ضمیر میں سمو دیا ہے۔ ہر خوبصورت عورت خوبصورت چیزوں کو پسند کرتی ہے۔ جیسے جڑاؤ ہار سونے کا... کیڈی لیک کی خوبصورت گاڑی، عمدہ سجا سجایا خوبصورت ڈرائنگ روم... مثلاً ساڑھیاں..... اگر آپ عورت کو یہ خوبصورتی دے سکیں تو وہ بہت جلد آپ کی گرویدہ ہو جائے گی۔''

''مدن گوپال جی۔'' میں نے بڑی مایوسی سے کہا — ''میں ایک غریب لیکھک ہوں۔ مہینے میں سو پچاس روپے مجھے رسالوں میں مضمون لکھ کر مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں ایک اخبار کا سب ایڈیٹر بھی ہوں۔ ایک سو پچیس روپے مجھے وہاں سے ملتے ہیں۔ اس پر میری بوڑھی ماں ہے۔ تین کنواری بہنیں ہیں۔ دو بیوہ موسیاں ہیں۔ جن کے سات ننھے ننھے بالک ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں

آنا۔ایک ساڑھی تک تو خرید نہیں سکتا۔موٹر گاڑی کہاں سے لاؤں گا ؟"

مدن گوپال جی نے آہستہ سے سوچ سوچ کر سر ہلایا۔پھر بڑے گمبھیر لہجے میں بولے ـــــ" تب تو تمہارے لئے دوسری ترکیب ٹھیک رہے گی۔"

" وہ کیا ہے ؟"

" اسے عشق کی دوسری ترکیب کہتے ہیں۔عام اصطلاح میں اسے بنا پیسے کا عشق کہا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس میں بڑی مہارت کی ضرورت ہے اور برابر تجربہ کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔"

" میں دن رات محنت کرنے کے لئے تیار ہوں۔آپ ترکیب تو بتائیے ؟"

" اس ترکیب کی مجبوری یہ ہے کہ عورتیں خوبصورت زیوروں، خوبصورت گاڑیوں اور خوبصورت گھروں کے علاوہ خوبصورت باتیں کرنے والے اور خوبصورت مزاج رکھنے والے مردوں کو بھی پسند کرتی ہیں۔اس کے علاوہ اگر وہ مرد خود بھی خوبصورت ہو تو کیا کہنا! مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کا سانولا چہرہ، چیچک کے داغ، گنجا سر اور ٹھگنا قد اس سلسلے میں آپ کے لئے بہت سی مشکلات پیدا کر دے گا۔"

میں نے کہا ـــــ " میں کسی ٹھگنے قد والی عورت سے عشق کر لوں گا۔مگر آپ ترکیب تو بتائیے۔

مسٹر مدن گوپال نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چند منٹ تک وہ کسی گہرے دھیان میں چلے گئے۔ جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو اُن کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہو چکی تھی۔ خوش ہو کر بولے —— "ترکیب سمجھ میں آگئی ہے۔ میرے خیال میں آپ مس بِملا سے عشق کر لیجئے۔"

"وہ جو کالج میں پڑھتی ہے اور بے حد نفاست پسند ہے؟"

"جی ہاں! آپ نے غور نہیں کیا ہو گا وہ عمدہ خوشبو کی عاشق ہے۔ وہ پیرس کی عمدہ سے عمدہ خوشبوئیں استعمال کرتی ہے۔ مگر میں جانتا ہوں اُس کی پسندیدہ خوشبو کیا ہے "Evening in Paris" اس خوشبو پر تو وہ جان دیتی ہے۔ آپ ایسا کیجئے کہ کل بازار سے وہی خوشبو لائیے۔ اُسے اپنے رومال پر لگائیے اور رومال کو جیب میں رکھ کر گلی کے نکڑ پر اُس کا انتظار کیجئے۔ جب وہ کالج جانے کے لئے گلی سے نکلے تو آپ اُس کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائیے۔ ممکن ہے وہ مسکرا دے۔ ممکن ہے نہ مسکرائے۔ بہر حال آپ اس کی پرواہ مت کیجئے۔ آپ مسکرا کر اُس کے قریب سے آگے نکل جائیے اور آگے نکل کر چند قدم چل کر اپنا رومال جیب سے نکال کر زمین پر گرا دیجئے۔ ایسے گرائیے جیسے آپ نے جان بوجھ کر رومال نہیں گرایا ہے۔ بلکہ خود گرا ہے۔ رومال کو گرتا دیکھ کر مس بملا یقیناً آپ کا رومال اُٹھا لے گی اور خوشبو اُن کے نتھنوں میں پہنچے گی۔ وہ آپ کو آواز دیں گی۔ آپ ذرا ٹھٹھک کر کھڑے ہو جائیے۔

مڑ کر دیکھئے تو آپ کا رومال اُس کے ہاتھ میں ہوگا۔ آپ 'تھینک یُو'، کہہ کر اُس کے ہاتھ سے رومال لے لیجئے۔ نفاست پسند خاتون ضرور آپ سے سوال کرے گی "کیا آپ کو بھی Evening in Paris پسند ہے؟" اس پر خوشبوؤں پر بحث چل نکلے گی اور رومال کی خوشبو سے بڑھتے معاملہ دل کی خوشبو تک پہنچ سکتا ہے۔"

میں نے خوشی سے اُچھل کر مدن گوپال جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے چومتے ہوئے بولا ـــ "واہ! واہ! اُستاد کیا ترکیب بتائی ہے۔ میں کل صبح ہی اس پہ عمل کروں گا۔"

"اور کل شام ہی کو مجھے اس کی رپورٹ دے دینا۔ پھر میں تمہیں آگے کی ترکیب بتاؤں گا۔"

دوسرے دن شام کو جب میں مدن گوپال کے گھر پہنچا تو انہوں نے میرے چہرے ہی سے اندازہ لگا لیا کہ کہیں پہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میرے اندر آتے ہی انہوں نے پوچھا ـــ

"کیا ہوا؟ مسکرانا بھول گئے تھے۔"

"جی نہیں.... مسکرایا تو تھا۔ مگر معلوم نہیں کیا ہوا۔ غالباً کچھ ایسی جھجکتی ڈرتی ہوئی رونی سی مسکراہٹ ہو گی۔ کہ اُسے دیکھ کر مس بملا کو غصّہ آ گیا انہوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور جلدی جلدی آگے نکل گئیں۔

"احمق! میں نے تمہیں آگے نکل جانے کو کہا تھا۔"

"سُنئے تو۔ وہ اتنے تیز تیز قدم اُٹھانے لگیں کہ مجھے اُن کا پیچھا کرنا دشوار ہو گیا۔ خیر صاحب! زندگی میں میں بھی اتنا تیز کاہے کو چلا تھا۔ کسی نہ کسی طرح بھاگ دوڑ کر ہانپتے کانپتے اُن کے سامنے سے نکل گیا اور پھر بڑی ہشیاری سے میں نے اپنا رومال بھی زمین پر گرا دیا۔ اور انہوں نے رومال کو گرتے دیکھ کر اُسے اُٹھا بھی لیا۔"

"شاباش!" مدن گوپال جی میری پیٹھ ٹھونک کر بولے — "شاباش!"

"سُنئے تو...... اس کے بعد جو انہوں نے میرے رومال کو ایک لمحے کے لئے دیکھا تو جلدی میں بُرا سا منہ بنا کر اُسے زور سے قریب کی گندی نالی میں پھینک دیا۔"

"ایں! وہ کیوں؟ تم نے خوشبو نہیں لگائی تھی؟"

"خوشبو تو لگائی تھی جناب! دراصل مجھ میں یہ بُری عادت ہے کہ میں رومال ہی میں تھوکتا ہوں۔ اور اُسی سے اپنا بلغم صاف کرتا ہوں۔ مِس بِملا کے ہاتھ میں بلغم لگ گیا تھا۔... اس پر انہوں نے مجھے وہ صلواتیں سُنائیں.... گندہ...... احمق.... نامعقول..... بدتمیز.. ... اور جانے کیا کیا کہا میں تو وہاں سے بھاگ گیا۔"

مدن گوپال نے اپنا ماتھا پیٹ لیا — "مجھے کیا معلوم تھا تم اپنے گندے

رومال میں خوشبو لگاؤ گے۔ اناڑی ہونا آخر ـــــ خیر! اب کیا ہو سکتا ہے؟ مِس بملا تو تمہارے ہاتھ سے گئیں۔ اب تم زندگی بھر اُس سے عشق نہیں کر سکتے۔"

میں نے مدن گوپال جی کے پاؤں پکڑ لئے۔ "نہیں! ایسا مت کہئے۔ میں تو عشق کروں گا۔ ضرور کروں گا۔ بھگوان کے لئے میری حالت پر رحم کیجئے۔ مجھے عشق کرنا سکھا دیجئے۔"

مدن گوپال جی نے مجھے اس طرح گڑگڑاتے دیکھا تو انہیں شاید میری حالت پر رحم آ گیا۔ اپنے غصّے پر قابو پا کر بولے "خیر! کوئی بات نہیں۔ اب میں عشق کرنے کی تیسری ترکیب بتاتا ہوں۔"

"عشق کی تیسری ترکیب ـــــ جلدی بتلائیے۔ جلدی بتلائیے میرے اُستاد۔ اور ترکیب معہ پرچہ استعمال بتایئے۔"

مدن گوپال جی بولے ـــــ "اس ترکیب کو پھولوں والا عشق کہتے ہیں۔ یعنی اس میں پھولوں کے ذریعہ عشق کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ تم پہلے ایک ایسی جگہ تلاش کر لو۔ جہاں عورت اکیلی بیٹھی ہو اور سامنے پھولوں کا تختہ گلزار کھلا ہو۔ یا آس پاس کہیں پر پھول ہوں۔ وہ عورت بالکل اکیلی ہو اور اپنے دھیان میں مست ہو۔ اُس وقت تم پھولوں کے تختے سے ایک پھول توڑ کر اُس کے پاس لے جاؤ۔ اور اُسے پیش کر دو۔ بڑی

ملائمت سے اور انتہائی عزت اور رکھ رکھاؤ سے......اور پھول پیش کرتے وقت کوئی خوبصورت سا فقرہ کہو!

جیسے..... جیسے..... لیجئے! پھول کے لئے پھول حاضر ہے —— غرضیکہ کوئی اچھی سی بات کیجئے۔ جس سے پھولوں کے ساتھ ساتھ عورت کے حسن کی تعریف کا پہلو بھی نکلتا ہو۔ عورت شرمائے گی، مسکرائے گی۔ مگر آپ کا شکریہ ضرور ادا کرے گی۔ بس وہاں سے بات چل نکلے گی۔ پھر موقعہ مناسب سمجھ کر بات کو آگے بڑھا لے جاؤ۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنا شروع کر دو اور جب لڑکی آپ سے آپ کی ٹھنڈی آہوں کی وجہ پوچھے تو اُسے صاف بتا دو۔ کہ اُن کی وجہ صرف تم ہو اور صرف تم ہو۔ اور صرف تمہیں سے مجھے عشق ہے۔"

"اہا ہا! کیا عمدہ ترکیب بتائی ہے مدن گوپال جی! نہ گاڑی کی ضرورت نہ ساڑھی کی۔ صرف چند پھول اور چند میٹھی باتیں۔ اب کے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا اپنے عشق میں۔ دیکھ لیجئے گا! اب آپ کا شاگرد ناکام نہیں لوٹے گا۔ میں کل ہی اس ترکیب کو آزماتا ہوں۔ مگر....."

"مگر کیا؟"

میرا چہرہ اک دم اُداس ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا —" ترکیب بتائی ہے تو لڑکی بھی تو بتا دیجئے۔ جس پر اسے آزماؤں۔"

سوچ سوچ کر مدن گوپال جی نے بتایا ——" وہ ریلوے گارڈ کی لڑکی

میری ڈی سوزا ہے نا، بڑی شوخ اور چنچل، ہر وقت اپنے کٹے ہوئے بالوں میں پھول لگائے رہتی ہے۔ بڑی رومانٹک لڑکی ہے۔ یہ ترکیب تم اُس پر ٹرائی کرو۔ اور کل شام کو مجھے رپورٹ کرو۔"

میں اپنے اُستاد کے ہاتھ چوم کر وہاں سے جلد ہی روانہ ہو گیا۔

لیکن دُوسرے دن جب میں شام کو مدن گوپال جی کے گھر پہنچا تو وہ میرا اُداس اور رُوٹھا ہوا چہرہ دیکھ کر خود بھی اُداس ہو گئے۔ بڑی بے دلی سے پُوچھنے لگے ــــ

"کیا ہوا۔ لڑکی اکیلی نہیں ملی ؟"

"جی نہیں ـــــ میری ڈی سوزا بالکل اکیلی بیٹھی تھی۔ اپنے مکان کے پچھواڑے میں سہ پہر کا سُہانا سماں تھا اور وہ بالکل اکیلی تھی۔ اور پچھواڑے میں گندے سے زنگ آلود ٹین کے ڈبّے، پرانے ڈرم، لوہے کے غلیظ پائپ اور بہت سا کوڑا کرکٹ جمع تھا۔ ساری فضا میں ایک عجیب کیف آور رومانی فضا طاری تھی اور طرح طرح کی خوشبوؤں سے رچی ہوئی تھی۔"

"تو پھول نہ ہوں گے۔ پچھواڑے میں پھول کہاں سے آئیں گے ؟"

"جی نہیں، پھول بھی تھے۔ پچھواڑے کی دیوار سے لگی ایک جھاڑی پر

بہت سے سفید لمبے لمبے چلم نما پھُول تھے۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں نے اُس جھاڑی میں سے ایک پھُول توڑا اور مُسکرا کر میری ڈی سوزا کو پیش کرتے ہوئے کہا ——

"پھُول پھُول کے لئے نذر کرتا ہوں۔"

"پھر اُس نے کیا کہا؟"

"چیں بہ چیں ہو کر بولی —— "بدھوا یہ تو دھتورے کے پھُول ہیں۔"

"بُدھو۔ احمق۔ جاہل۔" مدن گوپال جی چیخ کر بولے —— "تو نے دھتورے کے گندی، کڑوی بُو والے پھُول میری ڈی سوزا کو پیش کر دیئے۔" اُف ... اُف .... !"

"کیا کرتا اُستاد؟" میں نے مایوسی سے کہا —— "اور کوئی پھُول ہی نظر نہ آیا مجھے وہاں پہ۔ اور یہی بات میں نے میری ڈی سوزا سے بھی کہی تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ وہ چُپ چاپ بیٹھی رہی۔ کبھی پیر پٹکتی تھی۔ کبھی گیسو جھٹکاتی تھی۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں نے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنا شروع کر دیں۔ اس پر اُس نے گھبرا کر میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس نے میرے چہرے پر کرب کے آثار دیکھ کر پُوچھا ——

"کیوں جی! کیا آپ کے پیٹ میں درد ہوتا ہے؟"

میں نے گھبرا کر کہا — "جی ہاں!"

اس پر وہ بولی — "میرے خیال میں آپ فوراً ایک جُلاب لے لیجئے۔"

یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنسی اور ہنستے ہوئے اپنے گھر کے اندر بھاگ گئی۔ اُستاد! یہ کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر ایسی حقارت تھی کہ میں تو زندگی بھر اُس سے آنکھیں نہ ملا سکوں گا۔"

میں نے شرم سے اپنا سر جُھکا لیا۔

"چلے جاؤ!" مدن گوپال غصّے سے بولے — "میری آنکھوں سے دُور ہو جاؤ۔"

"نہیں اُستاد! بھگوان کے لئے مجھے بچا لیجئے۔ کسی ترکیب سے مجھے عشق کرنا سکھا دیجئے۔ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں ڈھائیں مار کر رونے لگا۔

مجھے روتے دیکھ کر اُن کے دل میں پھر رحم آ گیا۔ اُنھوں نے میرے آنسو پونچھے اور بولے — "اب میں تمہیں عشق کرنے کی چوتھی ترکیب بتاتا ہوں مگر خبردار! جو تم نے اس میں ذرا بھی غلطی کی۔"

میں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا — "اب کبھی بھی غلطی نہ کروں گا اُستاد!

میری گردن کاٹ لینا اگر رتی بھر اِدھر سے اُدھر ہو جاؤں۔ جس طرح تم کہو گے۔ اسی طرح کروں گا۔ بالکل اسی طرح ..... "

ملن گوپال جی بولے ـــ " یہ عشق کی چوتھی ترکیب ہے۔ اسے عشق بزور بازو کہتے ہیں۔"

" عشق بزور بازو ؟ "

" ہاں! اس میں انسان کو اپنی عقل سے کوئی کام نہیں لینا پڑتا۔ تمہارے لئے یہ ترکیب سب سے عمدہ رہے گی۔"

" جلدی بتایئے ـــ جلدی بتایئے ـــ میرے واجب تعظیم گورو! میرے محترم اُستاد!"

" اس میں زیادہ تردد کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک لڑکی چھانٹ لو۔ جو تمہیں سب سے زیادہ پسند ہو۔ اُسے اکیلا کہیں دیکھ لو۔ پھر اُس کے قریب جا کر بڑی دیدہ دلیری سے اُس کا ہاتھ پکڑ لو۔ اگر وہ ہاتھ چھڑاتے تو تم فوراً اُسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لو ـــــ اب عشق تمہارا کامیاب ہے۔ کیونکہ ہر عورت مردانگی کو پسند کرتی ہے۔"

کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ میں نے یہ ترکیب بھی آزما دیکھی اور اب میں یہ کہانی جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے لکھ رہا ہوں۔ میں اپنے عشق میں ناکام رہا ہوں۔ لیکن میں نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری۔

میرا ارادہ ہے کہ میں چھ ماہ کی یہ قید کاٹ کر پھر اپنے اُستاد کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ اور اُن سے عشق کرنے کی پانچویں ترکیب ضرور پوچھوں گا۔

کرشن چندر

تمت بالخیر

ہماری مطبوعات

کارِ جہاں دراز ہے (حصہ اول)	قرۃ العین حیدر	پاگل	خلیل جبران
" " " (حصہ دوم)	"	محبت اور جوانی	"
آگ کا دریا	"	ایک گدھے کی سرگزشت	کرشن چندر
فصلِ گل آئی یا اجل آئی	"	پھول کی تنہائی	"
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	الٹا درخت	"
پطرس کے خطوط	"	محبت کی رات	
زیرِ لب	صفیہ اختر	مضامین کرشن چندر	"
حرفِ آشنا	"	لذیذ پکوان	شائستہ کوثر
گنجے فرشتے	منٹو	نقوشِ زنداں	سجاد ظہیر
انارکلی	"	کلیاتِ جگر	جگر مراد آبادی
ٹھنڈا گوشت	"	آتشِ گل	
کرنیں	شفیق الرحمٰن	کلیاتِ شکیل	شکیل بدایونی
دو ہاتھ	عصمت چغتائی	کلیاتِ ساحر	ساحر لدھیانوی
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ	تلخیاں	"
تعمیرِ حیات	ڈیل کارنیگی	گلِ نغمہ	فراق گورکھپوری
زرد پتے	خلیل جبران		

مکتبۂ اردو ادب لاہور